Muntakhiba
Afsaane

Quddoos Sehbai

منتخبہ افسانے

سنہ ۱۹۴۴ء

مرتبۂ

قدوس صہبائی

ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف

کل ہند بزم نشر اُردو بھوپال

ناشر:- جعفری برادرس مالک

انوار احمدی پریس الہ آباد

قیمت ۲ عہ

فہرست

انتساب

ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان اُردو

کے تمام ترقی پسند

ادیبوں کے نام

منجانب

کُل ہند بزم نشر اُردو

بھوپال

پہلی پیش کش

اُردو زبان کے متعلق اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس مپرسی کے عالم میں ہے۔

یہ ایک ایسا اِدّعا ہے جس کا اظہار باوجود جنگ کے خلفشار اور علم وادب کی کس مپرسی کے بھی اردو کی خدمت گزار جماعتوں کے وجود اور اُردو زبان میں ہر علم و فن پر شائع ہونے والی مطبوعات سے مل سکتا ہے۔

کل ہند بزم نشر اُردو کی یہ پہلی پیش کش ہے۔ جو افسانہ نویسی کے انعامی مقابلے کے نتیجے میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس مجموعے میں اکثر نئے اور اچھے افسانہ نگاروں کے فکر و قلم کے نتائج بھی شامل ہیں لیکن بعض مسلمہ اور مشہور افسانہ نویسوں کے افکار سے یہ مجموعہ مزین نہیں ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نویسی کے جس مقابلے میں تقریباً اکتالیس افسانہ نگار شامل ہوئے ان میں بہت بڑی اکثریت بزم نشر اُردو کے ارکان کی تھی۔

انتخاب کے بعد نشر اُردو کی کمیٹی انتخاب نے پہلے تین افسانوں کو بندریج اول و دوم و سوم تسلیم کر لیا۔ چنانچہ ان نئے ادیبوں

کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ میں تینوں افسانہ نویسوں کو بزم نشر اردو کی جانب سے مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

تین انعامی افسانوں میں پہلا افسانہ مسٹر پریم ناتھ پردیسی کا ہے یہ ہونہار افسانہ نویس اگر اپنی کوششوں کو بروئے کار لانے میں صحیح راستے پر گامزن رہا تو یقین ہے کہ چند دن کے بعد اس کا شمار صنف اول کے افسانہ نویسوں میں ہونے لگے گا۔

دوسرا افسانہ مقصود فرحت صہبائی کا ہے۔ مقصود فرحت نے بچوں کی کہانیاں لکھنے میں کافی ملکہ حاصل کر لیا ہے۔ زیر نظر افسانہ "آوارہ گرد" ان کے افسانوں میں شاید پانچواں افسانہ ہے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ افسانہ نویسی کے محبوب مشغلے سے قریب رہ سکتی ہیں یا حوادث انھیں آئندہ اس کی اجازت نہ دیں گے۔ اپنی رفیقہ زندگی کی اس کامیابی پر میں خوش ضرور ہوں لیکن مقصودہ کی زندگی اب ادبی زندگی کی حدود سے نکل کر خانگی زندگی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ میری خواہش اور اپنی کوشش کے باوجود بھی انھیں ادب کی خدمت کا کم موقع ملتا ہے اور اپنی بچی کی پرورش کا زیادہ۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ شاید اولاد.... بھی ادبی زندگی کے لئے قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔

تیسرا افسانہ جاوید لطیفی کا ہے۔ جاوید احمد نگر کے ایک نوخیز ادیب

ہیں اور اب اُن کے افسانے ہندوستان کے اکثر اخباروں اور
ماہناموں میں شائع ہوکر قبول عام حاصل کر رہے ہیں۔ چمڑی کا بادشاہ
اُن کا کافی اچھا افسانہ ہے۔ لیکن اب اُن کی افسانہ نویسی کئی مرحلے
اور بھی طے کر چکی ہے۔
بقیہ افسانے مجموعے کے لئے منتخب کر لئے گئے ہیں اور یقین ہے کہ
نشر اُردو کے دوست اس کاغذ کے قحط اور نایابی کے زمانے میں اس
مجموعے کا پرجوش خیر مقدم کریں گے۔
میں شعبۂ تصنیف و تالیف بزم نشر اُردو کی جانب سے جعفری
برادرس انوار احمدی پریس الہ آباد کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے معنًا
بزم نشر اُردو کا ناشر بننا منظور فرما لیا ہے۔ اور اُن کی امداد سے یقین ہے،
کہ ہم بزم کی دوسری مطبوعات بھی جلد تر شایع کرنے کی کوشش میں
کامیاب ہوسکیں گے۔

قدوس صہبائی
ناظم۔ شعبۂ نشر و اشاعت
کل ہند بزم نشر اُردو۔ بھوپال

۱۰ر ستمبر ۱۹۴۴ء

جنت اور جہنم

پریم ناتھ پردیسی
ملک آنگن۔ فتح کدل۔ سرینگر

دفتر کی پریشانیوں سے فارغ ہو کر وہ اکثر شام کو پل پر آنکلتا تھا۔ شہر سے دور ہونے کے باعث یہاں بہت کم شور ہوتا تھا۔ اور پھیلی ہوئی تاریکی میں سب ایک جیسے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی سیالکوٹ سے آنے والی لاری بھوں بھوں کرتی ہوئی پل کو عبور کرتی۔ یا دور شنٹنگ انجن کی کرخت سیٹی سے فضا کی خاموشی ٹوٹ جاتی۔ اور اسے محسوس ہوتا کہ دنیا کا ہنگامہ تاریکی میں بھی خاموش نہیں پڑا۔ مہاجنی دور کا نظام پوری آب و تاب کے ساتھ رات اور دن۔ صبح اور شام چل رہا ہے۔ اور شاید چلتا رہے گا۔

کبھی کبھی سینما سے واپس آتے ہوئے فوجی سپاہی پہاڑی گیت گاتے گاتے، سونٹیاں گھماتے گھماتے، سگریٹ پیتے پیتے، یا ایک دوسرے کو گالیاں

دیتے دیتے پل پر سے گذر جاتے۔ انھیں اُس کے وجود کا احساس تک نہ ہوتا کہ کوئی اپنے وطن سے دو سو میل دور پل کے آہنی جنگلے سے اُلجھا ہوا ریت اور پتھّر کے بے پناہ میدان میں اپنے ملک کے غیر مرئی حُسن کے نقوش تلاش کر رہا ہے اور اسی جد و جہد میں اپنے فریب خوردہ تاثرات کو بہلا رہا ہے۔ وہ گذر جاتے۔ اور چھائی ہوئی تاریکی کا سناٹا، پھیلے ہوئے دریا کا نشیب و فراز۔ دور دور کی بے رونق سی پہاڑیوں کا غیر شاعرانہ تسلسل پھر اس کی نگاہوں کا مرکز بن جاتا آہ! اس نظام میں وہ کس قدر مجبور اور بے حقیقت تھا۔ ریت کے ذرّوں سے زیادہ بے مایہ اور ان میں دبے ہوئے گول مول پتھروں سے زیادہ بے حقیقت! آخر پیٹ ہی تو تھا جس نے اُسے دلکش وادی سے نکال کر بہت دور پھینک دیا تھا۔ جہاں ٹکٹیں بیچنا، سامان کھولنا، کرایہ لینا، اور کبھی کبھی اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر رشوت لینا بھی اُس کا معمول تھا۔ اس کا جسم گھٹا ہوا تھا۔ اعضاء میں بھی کافی تنومندی تھی۔ لیکن روح ——— ! کم بخت رشوت کے پیسوں سے دودھ پی پی کر بھی چمک نہ اٹھتی تھی۔

پل کے قریب، سڑک کے بائیں طرف چونے کی بھٹی تھی، اور ایک نانبائی کی دوکان، دوکان کے آگے شکستہ بنچ ہمیشہ خالی پڑی رہتی تھی۔ نانبائی بہت رات گئے تک چولھے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ شاید اُسے خریداروں کا انتظار رہتا تھا۔ میلے اور کالے برتنوں کو بھی ایک طرف سے اُٹھا کر دوسری طرف رکھ دیتا تھا۔ اور کبھی کھانسنے کے بعد موٹا سا بلغمی تھوک سڑک کے عین وسط

میں پھینک دیتا تھا۔

شکستہ بینچ کے نیچے کالا کثیف کتا نانبائی کی کھانسی پہچان کر ہی سڑک کے وسط میں کود کر پہنچتا۔ اُسے شاید معلوم تھا کہ کھانسنے کے بعد ہمیشہ نانبائی بلغمی تھوک پھینک دیتا ہے۔ نانبائی کتے کو اپنی تھوک چاٹتے اور کھاتے دیکھ کر دل ہی دل میں مسرت سی محسوس کرتا۔ لیکن کتے کے متعلق اُس کی آنکھوں میں ہمیشہ حقارت جھلکتی رہتی۔ "ذلیل جانور! جو صرف تھوک کھانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے" اسے فخر تھا کہ اسکی دوکان کی کوئی چیز۔ ہڈی، جلی ہوئی روٹی، باسی سالن رائگاں نہ جاتا تھا حتیٰ کہ بلغمی تھوک بھی جس کے لئے قدرت نے بہترین امیدوار بنچ کے نیچے منتظر رہنے کے لئے پیدا کیا تھا۔

چونے کی بھٹی آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑ جاتی تھی، گول گول بے حقیقت پتھر دہکتی ہوئی آگ میں جلنے کے بعد چونے کی ڈلیاں بنتے تھے۔ اب وہ بے حقیقت نہ تھے۔ عالیشان عمارتوں اور شاہی محلات کے کارخانوں میں اُن کے لئے مخصوص جگہ تھی۔ وہ بے جان ملبہ اور اونچی اونچی عمارتوں میں مضبوطی کے لئے استعمال ہونے والا تھا۔ اور بھٹی کا مالک اپنی خوشنما داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مستقبل کے خواب۔ حسین خواب دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے وہ بھی شام کو سرمئی سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے یا نانبائی کو چونے کے فوائد سمجھاتے ہوئے دیکھتا۔ کالا کتا بدستور نیم دائرہ کی شکل بنا کر شکستہ بنچ کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔ جنگلے کے پاس اُس کی آہٹ سن کر

وہ دُم کو پیٹ سے دبائے اُس کے پاس پہنچ جاتا اور پھر دم ہلا ہلا کر اُسے یقین دلاتا کہ میں ذلیل نہیں، وفادار جانور ہوں۔ اُس کی نگاہوں میں اس وقت عجیب چمک سی پیدا ہوتی جو تاریکی میں بھی اُسے نمایاں طور پر دکھائی دیتی۔ جتنی دیر وہ اس کے لمس سے محفوظ رہتا، اُسکی بشاشت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور نہ آنکھوں کی چمک میں کمی ہوتی شاید وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ دونوں اس نظام میں ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔ وہ نانبائی کا بلغمی تھوک کھانے کے لئے شکستہ بنچ کے نیچے اور میں شرفا اور غربا دونوں کی رشوتوں کا اُگال کھانے کے لئے ـــــ جو وہ ریلوے اسٹیشن کے پاس سڑک کے وسط میں پھینک کر چلے جاتے تھے۔

اُسے کُتّے سے پیار تھا۔

"کُتّا وفادار جانور ہے۔ اس کی طبیعت حساس ہے" بھٹی کے مالک کو دیکھ کر اس کی بشاشت ظاہر نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہ بے حقیقت پتھروں کو کندن بنا کر سیم و زر میں کھیلتا رہتا ہے۔ لیکن اُسے جو اس نظام میں مجبور اور بے حقیقت ہے۔ جو ابھی چونا نہیں بنا ہے۔ دیکھ کر وہ مچل اُٹھتا تھا۔ بے وقوف کُتّا۔! لیکن اس کی شام کی جد و جہد کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ اُسے اپنا مونس مل گیا تھا۔ اور ان دونوں کو کسی بھٹی کی تلاش تھی۔

ریت اور پتھر کا بے پناہ میدان جس کے ایک طرف اُداس ندی لیٹی ہوئی سی تھی۔ اُس کے سامنے تھا۔ اور دور دور کی بے رونق سی پہاڑیوں کا غیر شاعرانہ تسلسل!۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ دن کو بھی یہ میدان اسی طرح سنسان رہا کرتا تھا نہیں دن کو یہاں خوب چہل پہل اور گھما گھمی رہتی تھی۔ یو۔پی کے سینکڑوں مزدوروں کی بدصورت بیویاں اور ننگے بچے اس میدان سے پتھر اور ریت نکالا کرتے تھے۔ اور ٹوکریوں میں بھر کر سر پہ اُٹھائے ہوئے اسٹیشن پر کھڑی بے شمار ویگنوں میں لادتے تھے۔ ایک عجیب ترتیب میں اور ایک عجیب نظام کے ماتحت یہ سارا کام ہوتا تھا۔ ٹھیکہ دار کے معتبر کام کی نگرانی پر مامور تھے۔ اور جونہی ان کی نگاہ کسی مزدور یا عورت کو سستاتے دیکھتی تھی۔ تو جھٹ اس کے سر پر کھڑے ہوتے تھے۔

"حرامزادہ —— سور کا بچہ —— بیٹھ گیا —— !"

"بابو جی ذرا کمر سیدھی کر رہا ہوں —— !"

"اور تو —— چڑیل —— مالزادی! صبح سے دو ٹن ریت بھی تجھ سے نہ ڈھوئی گئی۔ شام کو سب سے پہلے ہاتھ پھیلاتی آئے گی۔ اُٹھ ری دلات مار کر، —— اُٹھ —— !"

"آج دس ویگن بھی بھرے نہیں گئے۔ توبہ! کس قسم کے مزدوروں سے پالا پڑا ہے۔ بالکل کام چور ہیں۔ کام چور! اور نیو دہلی کی سڑک جو وائسریگل لاج کو جاتی ہے کام پتھر اور ریت کے لئے رُکا پڑا ہوگا۔

اگلے مہینے حضور وائسرائے کو شملے سے آنا ہے اور ابھی تک۔ گاڑیاں پٹڑی پر کھڑی ہیں۔ ڈیمرج چڑھ رہا ہے۔ توبہ۔ واہگورو!"

سارا میدان اسی دَور سے گزرتا ہے۔ ننگے، سوکھے ہوئے بدصورت مردوں، عورتوں اور بچّوں کا تانتا پُل سے سٹیشن تک لگا رہتا ہے۔ اور اُن کے پیچھے دور مہاجن کے محافظوں کی چمکیلی اور بے مہر آنکھیں ان کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ کہ کہیں نیو دہلی کی سڑک اگلے مہینے تک ادھوری نہ رہ جائے۔ یا گاڑیوں پر بے ضرورت ڈیمرج نہ چڑھ جائے۔

چونے کی بھٹی سے کالا کالا دھواں عجیب نقوش بناتا ہوا اُڑ جاتا ہے اور نانبائی ہلکی آنچ پر میلے برتنوں میں باسی سالن کو گرم کرتا ہے شاید شام کو کوئی خریدار آ ٹپکے۔ اور کُتّا دن بھر میدان میں ننگے انسانوں کے سیلاب میں گھومتا پھرتا ہے۔

اسٹیشن سے چھن چھن کی آواز آتی ہے۔ سیٹیاں بجتی ہیں۔ جھنڈیاں لہراتی ہیں۔ ایک گاڑی آتی ہے ایک جاتی ہے۔ ہزاروں لوگ جوان، بچے، بوڑھے، عورتیں، آتی جاتی رہتی ہیں۔ تانگے چلتے رہتے ہیں۔ موٹریں پوں پوں کرتی نکل جاتی ہیں، مسافر کرائے ادا کرتے ہیں سامان تلواتے ہیں۔ بابوؤں کو رشوتیں ملتی ہیں۔

سر پر ٹوکریاں اُٹھاتے ہوئے مزدوروں اور بچوں کو دیکھ کر کبھی کبھار کسی سے رہا نہیں جاتا، ہنس دیتا ہے۔ گندے انسان۔ بچّوں

تک کو کام پر لگا دیتے ہیں۔ جیب کترے!"
اور کبھی ٹھیکہ دار کا معتبر اس کے ہاتھ میں چونّی رکھ کر کہتا ہے
"لکھیے جناب۔

دس ویگن پتھر ——— ۲۵۰ ٹن نیو دہلی
باراں ویگن ریت ——— ۲۸۸ ٹن نیو دہلی
چار ویگن بجری ——— ۱۰۰ ٹن جوگندر نگر
دو ویگن پتھر ——— ۵۰ ٹن کالہ موئے
شکریہ ——— ست سری اکال ———"

وہ چپکے سے چونی جیب میں ڈالتا ہے۔ اور پھر شام کو میزان لگانے کے بعد ہندسے تیار کرتا ....

پتھر .... ۸۴۰۰ ٹن
ریت .... ۸۰۶۴ ٹن
بجری (اشیائے تعمیری)، ۸۰۰۲ ٹن۔ علیٰ ہٰذا القیاس
اس کے بعد آہنی پُل — چونے کی بھٹی — اور کالا کُتّا!

———×———

ایک شام کو گاڑیاں چلی گئی تھیں۔ شنٹنگ انجن رُخ پھیر کر شیڈ کے نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔ اسٹیشن پر خاموشی سی چھا گئی تھی۔ اسکی جیب میں چھ آنے تھے جو شام کو دودھ پی کر بچ گئے تھے۔
محصول خانے کے سب اہل کار اپنے اپنے کواٹروں میں چلے گئے

تھے۔ صرف دو تین چپراسی سڑک پر آنے والے نئے افسر کی تعریفیں
کر رہے تھے۔ جسے آج رات کی گاڑی سے پہلی بار آنا تھا۔ اور ساتھ
ہی ساتھ وہ چمڑے کے کمر بندوں پہ پالش کر رہے تھے۔

"پورے پندرہ سو تنخواہ لے گا۔"

"قرض بھی سر پہ ہوگا۔" دوسرے نے کہا

"قرض؟ بلے بلے۔ اتنی تنخواہ پر بھی قرض؟ نشہ کرتا ہوگا!

"اور کیا؟"

"حرامی! نشہ نہیں کرتے۔ جوا کھیلتے ہیں۔ بڑے افسر بھی کھیلتے
ہیں۔ کلب نہیں دیکھا ہے۔ تو تو کنوئیں کا مینڈک ہے۔ مینڈک!"

"سنا ہے ماتحتوں کو خوب پالتے ہیں۔"

"ہی۔۔ ہی۔ ہی۔ خدا سلامت رکھے، بخت ہوگا تو سب کچھ
دھرا رہ جائیگا۔"

تینوں نے مل کر قہقہہ لگایا۔

"کون ہوتا ہے بھلا؟" ایک نے بیڑی سلگا کر پوچھا۔

"ہوگا کہیں بنگال کا۔ آسام کا! وہاں سے پنشن ملی ہوگی اور
اب یہاں منگائے گئے ہوں گے۔" دوسرے نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہُش۔ پنجاب کا ہے۔ پنجاب کا۔ اور پنجابی زیادہ بُرے نہیں ہوتے۔
تیسرے نے کہا۔

"آج پتھر کی کے گاڑیاں گئیں؟"

"سترہ —"

"بس —؟"

"بے چاری لاجونتی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ رو تی تھی۔"

"کیوں بھلا؟"

"وہ معتبر ہے نا — وہ سکھ سالا — اُس نے پیٹا تھا۔ کہتا تھا دو دن کی مزدوری میں سے میرا حصہ نہیں دیا۔"

"رام رام —"

"دیکھ کیا چمکا دیا ہے چہرے کو۔ زور سے پالش ملو۔ آج کئی افسر اسٹیشن پر آئیں گے۔"

اُسے دیکھتے ہی تینوں چپ ہو گئے۔ وہ منزل مقصود کی طرف بڑھا۔ اس کا دل ملول تھا۔ ہندسوں میں غلطی ہو گئی تھی اور اسٹیشن ماسٹر نے اُسے "کام چور" کہا تھا۔

شکستہ بنچ کے نیچے اُس کا مونس نہ تھا۔ نانبائی حسب عادت چولھے کے نزدیک بیٹھا۔ تھوک سڑک پر پھینک رہا تھا۔ شائد اُسے آج دمہ کا شدید دورہ پڑا تھا۔

وہ جنگل کے پاس پہنچا پتھریلے اور ریتیلے میدان کے وسط میں آگ جل رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ سے ہوتا ہوا عین اسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں نیچے آگ جل رہی تھی۔ اس کا مونس کتا پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا

چولھے کی طرف للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آٹھ دس کشمیری مسلمان آگ کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ مٹی کی ہانڈی چڑھی ہوئی تھی ہلکے ہلکے بوجھوں کا ڈھیر ایک طرف تھا شاید وہ مزدوری کرنے کے لئے باہر جا رہے تھے۔

اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اُن میں سے صرف چائے بنانے والا ہی سارے ہندوستان کا واقف تھا۔ باقی پہلی مرتبہ جا رہے ہیں۔ جبھی تو وہ بار بار سوکھے دریا کے پاٹ کی وسعت کو بھاری بھر کم آہنی پُل کو اور دور دور کی بے رونق سی پہاڑیوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"اب جموں سے نکل کر شالکوٹ آئے گا۔ شالکوٹ" چائے پکانے والے نے پُر حسرت لہجے میں کہا۔

"اور پھر امرتسر۔ وزیر آباد۔ لالہ موسیٰ۔ لوفر۔ اور پھر دلّی!۔ پہلی بار جانے والے مزدور اتنے نام سن کر حیران رہ گئے۔ اُن کی آنکھیں آگ کی روشنی میں بہت بڑی ہو گئیں۔ شاید اُنھیں وہیں جانا تھا"

"کشمیر کچھ بھی نہیں۔ دلی دساور ہے۔ ریل گاڑی۔ ٹرام۔ چاندنی چوک۔ داس رائے کا گھر۔ گرمی۔ اور مزدوری۔ ہا ہا ہا"

چائے پکانے والے نے پھر کہا۔ غیر واقف لوگ ششدر رہ جاتے تھے اور ہندوستان کا واقف بار بار ہانڈی کا ڈھکنا اُٹھاتا تھا۔

اُس نے پھر "دو من بوجھ اُٹھاؤ تو آنہ۔ دس سیر اُٹھاؤ تو آنہ۔

سارا دن ہٹرک کے کام پر رہو تو چودہ آنے ۔بس روپیہ سے کم نہیں بنتا خدا کی قسم ۔!"

ایک ۔ نے جو سب سے عمر میں کم تھا کہا ۔"اچھا چاول ملتے ہیں وہاں؟"

"ہت ۔ احمق ! وہاں آٹا کھاتے ہیں اور گھی ۔چاۓ پینے کے کوئلے خرید و اور مزے سے روٹی پکاؤ ۔گوشت پکاؤ ۔چاۓ بناؤ ۔ نہ لینے نہ دینے ۔!"

غیر واقفوں کے چہروں پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ گھی کی چمک بھی پھیل گئی ۔ واقف مزدور نے دور کی پہاڑیوں کو دیکھ کر کہا ۔ واللہ ! کشمیر تو جہنم ہے ۔ اب دیکھو گے ۔ دلی کیا ہے ؟ کتنا بڑا شہر ہے ۔ ہر طرف دولت ہی دولت ہے ۔" اتنے میں چاۓ تیار ہو گئی تھی ۔

سب نے اپنے اپنے سامان سے مٹی کے پیالے اور روٹیاں نکالیں اور چاۓ پینے لگے ۔ گلابی رنگ کی چاۓ جس میں بہت تھوڑا دودھ تھا ۔

کتا چولھے کے اور نزدیک آگیا ۔

واقف نے چاۓ کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا "صبح کی روٹی شال کوٹ میں ٹھیک ہے نا ۔ رات کا سفر اچھا رہتا ہے ۔"

سب نے اثبات میں سر ہلا دئے ۔ بات پکی ہو گئی کہ صبح کی

چائے شال کوٹ میں۔ اور رات کا سفر اچھا رہتا ہے۔

پیالیاں ختم ہوگئیں۔ واقف نے ہانڈی سے اور چار پیالیوں میں انڈھیلتے ہوئے کہا "دو آنے گشتم ہے۔ لیکن بڑے اصیل لوگ ہیں واپسی پر تنگ نہیں کرتے۔ ایک، دو روپئے۔ اور پھر مل میرے بھائی سرکار کا گھر کس نے بھر دیا ہے۔؟ ہی۔ ہی۔ ہی۔!"

سب نے زور سے قہقہہ لگایا واپسی کا سارا سامان واقف نے ایک ہی سانس میں باندھ کر رکھا اور اُن کے وجود سے بے حقیقی اور بے مائگی کا ملمع آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ اس کے عوض بے بسی اور بے چارگی کا خول چڑھنے لگا۔ مہاجنی نظام میں سب اپنی اپنی جگہ مطمئن اور شاد ہیں۔ اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ حتیٰ کہ کالا کُتا بھی۔ جو روٹی کے ایک ٹکڑے کو اگلے پنجوں میں دبا کر اطمینان سے کھا رہا تھا۔ مزدور سامان باندھ کر اُٹھے۔ اور سڑک کی طرف آنے لگے۔ وہ بھی اُن کے ساتھ ساتھ چل کے آہنی فٹ پاتھ سے واپس مڑا۔

سگنل ہو گیا تھا۔ نیلے رنگ کی بتی کھمبے پر چمک رہی تھی۔ شائد گاڑی کنٹونمنٹ کے سٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔

کُتا بھٹی کے مالک کی طرح سڑک پر چہل قدمی کرنے لگا۔ اس نے بجلی کی روشنی میں سڑک کے وسط میں اپنے محسن کے بلغمی تھوک بھی دیکھیں لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ پیٹ بھرا تھا۔ شائد اسی لئے!

اور نانبائی نے حیرت سے اُس کے حرکات دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔

"آج سست ہو گیا ہے۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ٹہل رہا ہے

سالا۔ ذلیل کُتا۔ !"

آگے آگے کشمیری مزدور مسرت میں جھومتے جھومتے سیالکوٹ

کی سڑک پر جا رہے تھے اور اُن کے پیچھے پیچھے دن کا "کام چور"

بے ترتیبی میں بادل ناخواستہ اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ !

فرسٹ کلاس ڈبے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا نکلا۔

محصول خانے کے افسر نے اُسے سلام کیا اور اس کے ساتھ درجن بھر

وردی پوش چپراسیوں نے سلیوٹ کیا۔

نئے افسر پہلی مرتبہ پندرہ سو روپیہ ماہانہ پر ریاست میں آرہے تھے

وہ ریل کے راستے سے جنتِ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اور دوسرے

راستے سے درجن بھر کشمیری مزدور پیٹھ پر بوجھ اُٹھائے جہنم سے نکل گئے!

دہلی میں نئی سڑک بن رہی تھی۔ اگلے مہینے حضور وائسرائے کو

شملے سے آنا تھا۔ یو۔پی کے سینکڑوں مزدور عورتیں اور بچے ہر

روز پتھر، ریت اور بجری سے بھری ہوئی گاڑیاں ریل کے ذریعہ سے

وہاں بھیج دیتے تھے۔ اور سیالکوٹ کی سڑک ہر شام کو سینکڑوں

انسانوں کو وہاں کام کرنے کے لئے سفر کرتی ہوئی دیکھتی تھی۔

ادا کر کے اپنی زمین چھڑا سکے گا۔
گاؤں سے چلتے وقت مول چند اپنے چھوٹے بھائی سے کہہ آیا تھا کہ میں مزدوری کر کے بہت سا روپیہ بچاؤں گا۔ اس سے سارا قرضہ ادا ہو جائے گا۔ لیکن ابتدائی زمانہ میں بہت دن تو نوگرفتار وحشیوں کی طرح آوارہ پھرتا رہا، جو تھوڑا بہت کام ملا وہ خود اُس کی بسر اوقات کے لئے کافی نہ تھا۔ اس لئے گھر والوں کو کیا بھیجتا وہ مصیبتوں میں اور بھوک کے جھمیلوں میں بمبئی اور احمد آباد جیسے شہروں میں رہ کر ایسا پھنسا کہ گھر کوئی خط پتر نہ لکھ سکا۔ اور گھر والوں نے بھی سمجھ لیا کہ مول چند مر گیا۔

× × × × × × × × × ×

چار پانچ روز سے مول چند بھوپال جیسے نئے صنعتی شہر میں جہاں ابھی ابھی ایک دو کارخانے چالو ہوئے ہیں آیا ہوا تھا۔ بمبئی کو وہ اس لئے چھوڑ آیا تھا کہ وہاں مزدور کو کافی مزدوری ملنے کے باوجود بھی مہنگائی مارے ڈالتی تھی، یہاں آتے ہی اُس نے شہر، اور فوجی کمپنیوں کے سارے کارخانے چھان مارے لیکن کہیں بھی اُسے پیٹ بھرنے کا سہارا نہیں ملا۔ محنت مزدوری کا جو کام ملا اُس میں آٹھ دس آنہ سے زیادہ پیسے نہ ملے۔ اُس غریب کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بھوپال سارے ہندوستان میں اکیلا ایسا مقام ہے جو غذائی بحران سے بچا ہوا ہے۔ وہاں غلہ اور کھانے پینے کی چیزیں نسبتاً

مہاجنی دَور کا نظام ایسے ہی چلتا ہے۔ ایسے ہی چلتا رہے گا۔
یہاں بھی کوئی غیر مطمئن نہیں۔ ناشاد نہیں !!!

آوارہ گرد

(از مقصودہ فرحت صہبائی)

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ لالہ رام لال ورما کے نوکروں نے باغ کے کسی جھنڈ میں کسی شخص کی جھلک دیکھی۔ جو ایک درخت کے سایہ میں کھڑا ہوا تھا۔ ایک نوکر نے للکار کر پوچھا کون؟" کچھ جواب نہ ملا۔ دوسرا نوکر ڈرتا ہوا گیا۔ اندر سیٹھ کو خبر دی۔ سیٹھ صاحب باہر آئے۔ چور کو گرفتار کر لیا گیا۔ نوکروں نے ہاتھ پاؤں باندھ کر پہلے خوب مرمت کی۔ چور کی منت سماجت بے کار گئی۔ اور اُس کے بعد ٹیلیفون کر کے پولیس کے سپرد کر دیا گیا ——— یہ چور تھا۔ ایک دیہاتی غریب کافی مدت سے مزدوری کی تلاش میں سرگرداں۔ گاؤں میں اس کی زمین اور مکان ساہوکار نے قرضے کی وصولی میں ضبط کر لیا تھا۔ اس لئے گاؤں واپس جانا اُس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کو بتایا گیا تھا کہ آج کل لڑائی کا زمانہ ہے۔ مزدوروں کی بہت ضرورت ہے۔ تیس ۳۰ چالیس روپئے تنخواہ ملے گی۔ اور اس طرح وہ اپنا قرضہ

کہیں زیادہ سستی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ بھوپال کے باشندوں کا روزانہ معیار زندگی اور روزانہ آمدنی کا اوسط باہر کے لوگوں کے مقابلہ میں کہیں پست ہے۔ اور ہر مزدور کی مزدوری کا معاوضہ خواہ وہ صنعتی مزدور ہو۔ یا تعمیرات سرکاری کا مزدور یا فوجی چھاونی میں کام کرنے والا راج مزدور، برٹش انڈیا کے مزدور کے مقابلے میں آدھے سے بھی کم ہے۔

دونوں وقت اس کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ لیکن وہ ہر وقت یہ محسوس کرتا تھا کہ فاقہ کشی کی سرحدوں پہ کھڑا ہے۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ اگر کہیں دیہات میں چلا جایا جائے تو یہ حالت نہ رہے گی۔ بھوپال میں اُس نے منڈی سیہور کا نام سنا تھا اس لئے وہ سیہور کی طرف چلدیا۔ اور دن بھر میں ۲۴-۲۵ میل کا سفر طے کرنے کے بعد شام کو جب سیہور پہنچا تو تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ ایک باغ میں کنواں دیکھ کر پانی پینے کے لئے باغ کے اندر بغیر اجازت چلا گیا وہاں اس نے میوے دار پھلوں سے لدے ہوئے درخت دیکھے۔ بھوک کے مارے وہ بے تاب ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک ایک پھل کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اور اُسے محسوس ہونے لگا۔ کہ پھلوں میں ایک قسم کی مقناطیسی کشش اس کے لئے پیدا ہو گئی۔ وہ چند منٹ ابھی زبان پر پکے ہوئے امرود، سنتروں اور بیروں کا مزا محسوس کرتا رہا پھر بلا ارادہ اُس کا ہاتھ بڑھا۔ اور دو خوب زرد اور بڑے بڑے امرود

اس نے توڑ کر کھانا شروع کر دیئے۔

یکایک اس کی نظر مالی پر پڑ گئی۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گیا اور ایک طرف بیٹھ کر اندھیرے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی عالم میں وہ گرفتار ہو گیا۔

× × × × × × × × × × ×

عدالت سے مول چند کو آوارہ گردی اور چوری کے جرم میں ایک سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔ اپنے چور ہونے میں تو خود اُسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ کیونکہ شام کو اندھیرا ہوتے ہوتے کسی کے باغ میں بغیر اجازت گھس جانا اور پھل توڑ توڑ کر کھانا شروع کر دینا چور کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ مگر آوارہ گردی کا گناہ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اُس کی سمجھ سے حکومت کے سب قانون بالاتر تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ ریاست میں باہر کے آدمی اگر اپنے چال چلن اور شناخت کے بارے میں کوئی قابل اطمینان ثبوت نہ پیش کر سکیں تو اُن کو آوارہ گردی میں سزا دے دی جاتی ہے۔ سنٹرل جیل میں جہاں مول چند اپنی سزا کاٹ رہا تھا۔ اس کی ملاقات ایک اور قیدی سے ہو گئی۔ یہ سیاسی قیدی تھا۔ اور سیہور کا ایک مشہور وکیل اور لیڈر تھا۔ مول چند کو جب فرصت ملتی تو پریم ناتھ سے ہندی کی کتابیں پڑھتا۔ اور اپنے فاقہ کشی اور پریشانی کے دن یاد کر کر کے قید کی زندگی کو آزادی پر ترجیح دیتا۔ پریم ناتھ نے اُسے بتایا تھا کہ

لوگ کھیتوں میں اپنا خون چھڑک کر فصل تیار کرتے ہیں۔ سخت محنت کے باوجود بھی فاقوں مرتے ہیں۔ لیکن نتیجے میں کسان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اور یہ سب کچھ سرمایہ داری کی بدولت ہے۔ غریب اپنے گھروں میں ان کال کوٹھریوں میں تپ دق اور ملیریا سے گھل گھل کر مر جاتے ہیں۔ اس کی ذمہ دار بھی امیروں کی دولت مندی اور حکومت کا نشہ ہے۔ اور ان کے لئے ایسی بے کار اور بے مزہ زندگی سے قید خانہ ہی بہتر ہے۔

× × × × × × × × × ×

مول چند سزا ختم کر کے باہر نکلا تو پھر پریشان تھا کہ کیا کرے کہاں جائے۔ اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ اس کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وہ کہاں جائے۔ اور خصوصاً رات کہاں گذارے۔ ابھی دن کا بڑا حصہ باقی تھا۔ اس نے سوچا کہ شہر میں چل کر کچھ محنت مزدوری کرے تاکہ کھانے کا تو سہارا ہو اور شاید کہیں جاڑے کی برفانی رات گذارنے کا بھی سہارا مل جائے۔ شام تک اُسے کوئی کام نہیں ملا اور ٹھنڈی ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی۔ شہر کی بڑی عمارتوں کو دیکھ کر ان کے اندر جلتی ہوئی آگ اور روئی میں دبے ہوئے سیٹھوں کی زندگی پر اُسے رشک ہونے لگا۔ لیکن اس کی نفسی کیفیت کی یہ شدت بھی سردی کو کم نہ کر سکی۔ بلکہ اپنی بے کسی اور غریبی کا احساس زیادہ ہو گیا۔ اُس نے

چلتے چلتے بآواز بلند کہا۔ کہ اتنی سردی اور پرانی چادر کیسے گزر ہوگی۔"
اس کے پاؤں بھاری ہوئے گئے داہنے ہاتھ پر فری مسافر خانے
کی عمارت تھی۔ مول چند کو مگر یہ معلوم نہ تھا۔ اس نے راہ گیر سے
پوچھا کہ اس گھر میں سے لوگ برابر اندر باہر کیوں آجا رہے ہیں۔ اور
جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ یہ مسافر خانہ ہے تو وہ بھی سیدھا اندر چلا گیا۔
"تمہارا کیا نام ہے؟" منشی نے پوچھا۔
"مول چند۔"
"کہاں کے رہنے والے ہو۔؟"
"ضلع برہان پور کے۔"
"باپ کا نام۔؟"
"کھیم چند۔"
"کیوں آئے ہو۔؟"
مول چند سٹ پٹا یا۔ مگر اس نے سنبھل کر کہا۔ روزگار کے لئے۔
"تمھیں کبھی سزا تو نہیں ہوئی۔؟" منشی نے آنکھ ملا کر پوچھا۔"
مول چند کا چہرہ سفید ہو گیا۔ اور منشی نے اس کے چہرے کے تاثرات
کو تاڑ کر کہا "بولو! بولو! کس جرم میں سزا ہوئی ہے۔؟" مول چند
سے کچھ جواب دیتے نہ بن پڑی۔ گھگھیا کر اُس نے کہا "حضور منشی جی!
میں بےقصور تھا۔" منشی کو یقین ہو گیا سزا یافتہ ہے۔ اور اُس نے
ڈانٹ کر کہا "نکل جا بدمعاش تیری...... ورنہ ابھی داروغہ

کو بلا کر پھر بڑے گھر کی سیر کراؤں گا"۔

مول چند کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جو لوگ آوارہ گردی میں سزایاب ہوتے ہیں جیل سے باہر جا کر اگر وہ ہفتے عشرے میں اپنی کوئی قابل اطمینان ضمانت نہ دے سکیں تو انھیں پھر سزا دے دیجاتی ہے۔ اس خیال سے وہ ڈر گیا اگرچہ اُس نے بار بار یہی سوچا تھا کہ اگر کھانے کو نہیں ملا تو پھر جیل کے سوا کیا چارہ کار باقی رہ جائے گا۔ اس کو پریم ناتھ کی بات یاد آگئی کہ

"مول چند اگر تیری ساری عمر کی محنت کی کمائی اور محنت سے سر بہ دام کا اُٹھایا ہوا فائدہ ایک جگہ جمع کیا جائے تو کئی بنگلے، سیکڑوں گز کپڑے کے تھان اور سیکڑوں من اناج مل سکتا ہے"۔ مگر اُس نے سوچا کہ پریم ناتھ کی بات سچی ہونے کے باوجود بھی نہ تو میرے پاس سردی سے بچنے کے لیے ایک گرم کپڑا ہے نہ کھانے کو روٹی کا ٹکڑا، نہ سر چھپانے کو جگہ یہی سوچتا ہوا وہ آہستہ آہستہ ٹہلتا۔ اور مسافر خانے سے باہر نکل گیا اب خوب اندھیرا ہو گیا تھا اور بجلی کی روشنی دوکانوں پر رکھے ہوئے سامان کی زینت کو دوبالا کر رہی تھی اُسے یہ منظر بہت بھایا اور آہستہ آہستہ ایک ایک دوکان کا جائزہ لیتا ہوا وہ چوک کی طرف چل پڑا۔

× × × × × × × × ×

چوک میں مول چند ٹھیر گیا۔ وہ جامع مسجد کی عالیشان عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ نماز پڑھنے کے لئے لوگ اندر جا رہے تھے۔ اور ایک تانتا

بندھا ہوا تھا۔ بہت دیر تک بغیر ارادہ وہ اس منظر کو دیکھتا رہا۔
یکایک اُس کی نظر پڑی کہ سیڑھیوں پر بیسیوں فقیر اور بھک منگے ہندو اور
مسلمان ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اور کوئی نہ کوئی رحمدل آدمی کسی نہ کسی
کے ہاتھ پر پیسے دو پیسے رکھ دیتا ہے۔ مول چند کے قدم خود بخود اُٹھ گئے
اور وہ بھی سیڑھیوں پر جا کھڑا ہوا۔ اُسے خیرات پسند نہ تھی۔ اسی واسطے
اُس نے دوسرے فقیروں کی طرح ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ علاوہ ازیں
وہ ڈیل ڈول کا آدمی تھا؛ جوان طاقت ور اور دیوہیکل اُسے خیرات
لیتے شرم آتی تھی۔ لیکن بغیر ارادہ بھی وہ وہیں جم کر رہ گیا۔
کسی نے مول چند کو بھی دو پیسے دیئے۔ جنھیں بادلِ ناخواستہ
اُس نے لے لیا۔ پیسے لے کر وہ جلدی نیچے آیا اور بھنے چنے خرید کر پھر
سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کھانے لگا۔ اب نمازی باہر آنا شروع ہو گئے
تھے اور فقیروں کی مستعدی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن مول چند چنوں
کے پھنکے لگا رہا تھا۔ اور ہر پھنکے کے بعد اُسے اپنے جسم میں نمو کی طاقت
بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جب سب نمازی جا چکے تو شاید مولچند
کو سب سے کم پیسے ملے ہوں۔ مگر اس کے پاس بھی سوا آنہ موجود تھا
وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ اور چنے لے کر کھانا چاہیئے۔ اس نے یہ بھی
محسوس نہیں کیا کہ فقیر بھی ایک ایک کر کے جا چکے ہیں اور وہ اب اکیلا
سیڑھیوں پر کھڑا رہ گیا ہے۔

× × × × × × × × × × × × ×

جامع مسجد کے امام صاحب باہر نکلے۔ اُن کے ساتھ ایک ملازم اور دو شاگرد بھی تھے۔ اُنھوں نے مولچند پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالی اور ملازم کو حکم دیا کہ پھاٹک میں قفل لگا دے۔ پھاٹک میں قفل لگ گیا اور جب امام صاحب مولچند کے برابر پہونچے تو اُنھوں نے پوچھا "کیسا کھڑا ہے۔؟"

مول چند نے سوچا کہ کیا جواب دے۔ اور ابھی جواب اُس کی سمجھ میں بھی نہ آیا تھا کہ بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا "سرکار نوکری کے لئے"

"نوکری کے لئے" اُنھی کے الفاظ امام صاحب نے دُھرائے اور پھر سوچ کر بولے "نوکری کیسی۔؟"

"پیٹ بھرنے کے لیے سرکار" امام صاحب نے یہ جواب سُن کر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور سر سے پاؤں تک مولچند کا جائزہ لیا۔ اور ذرا رک کر بولے "لڑائی پر جایئے گا"

امام صاحب شہر کے معزز آدمی تھے۔ اور حکومت نے اُنھیں بھی بھرتی کے لئے آدمی لانے کا مجاز کیا تھا۔ فی آدمی اُنھیں چند بیگہ معافی میں اور پچاس روپیہ نقد ملتے تھے۔

مول چند نے کچھ سوچا، پھر اپنی تنہائی، افلاس اور بھوک کا خیال آتے ہی بول اُٹھا "جاؤں گا حضور!"

رات مول چند نے امام صاحب کی ڈیوڑھی میں گزاری۔ صبح اُسے

سمندر پار بھیجی جانے والی ٹریننگ بٹالین میں بھرتی کر لیا گیا۔ مول چند اب وردی پہنے اکڑتا پھرتا ہے۔ اور امام صاحب کی کلاہ وفاداری میں یہ اکتالیسویں کلغی لگ چکی ہے۔ اس سے پہلے وہ چالیس آدمی جو بھوکے اور آوارہ گرد تھے بھرتی کرا چکے ہیں۔

چڑی کا بادشاہ

(از۔ جاوید لطیفی)

چڑی کا بادشاہ! میرے دماغ میں پھر یہ الفاظ تازہ ہو گئے۔ چھ مہینے کی مسلسل کوشش اور کشمکش کے بعد بھی میں انھیں نہیں بھلا سکتا۔ آخر ان الفاظ کے اندر ایسی کیا خصوصیت تھی، ان کی اہمیت کیا تھی۔؟ میں نے بار بار سوچا اور اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ چھ مہینے پہلے جب میں نے کالج کو خیرباد کہکر وسنتی سے شادی کا سوال کیا تو وہ گویا ایسی بن گئی جیسے ہم میں کبھی محبت تو کیا شناسائی بھی نہ تھی جب میں نے مجبور کیا تو اس نے دنوں ٹالنے کے بعد ایک دن چڑ کر یہی الفاظ میرے لئے ادا کئے تھے کہ "مسٹر منوہر! منھ دھو آؤ۔ ذہین اور مالدار ہونا کسی حسین دل کو لبھانے کے لئے کافی نہیں ہوا کرتا۔ تم نے مجھے

مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے میں تم سے صاف کہے دیتی ہوں کہ میں اپنی شادی
کسی خوبصورت شاندار اور وجیہ آدمی سے کروں گی۔ تم تو "چمڑی کے بادشاہ"
سکے ہو۔ تم سے اور میں شادی کروں۔ شی! شی!! شی!!!

اور اس دن کے بعد وسنتی نے مجھ سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا
اور "چمڑی کا بادشاہ" میرے دماغ میں مسلط تھا۔

یہ بات کوئی جھوٹی بات بھی نہ تھی۔ میری صورت چیچک نے
بالکل بگاڑ دی ہے۔ ناک چپٹی ہو گئی ہے۔ پیشانی پر تقریباً نصف انچ گہرائی
کا ایک گڑھا پڑ گیا ہے، داہنے گال پر کان کی لو سے ہونٹ کے سرے تک
ایک گہری لکیر اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ماتا نے اس جگہ پر بڑے بڑے
آبلے ایک خط مستقیم کی شکل میں پیدا کئے تھے، اور سب سے زیادہ بدنما
میرے بالائی ہونٹ کے عین وسط میں ایک شگاف ہے جسے دیکھ کر ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سیاہ پنسل کی لکیر سے اوپر کا ہونٹ دو حصوں
میں تقسیم کر دیا ہے۔

وسنتی حسن و دلربائی کا پیکر تھی اور سمجھدار اور پڑھی لکھی، اپنا
شریک حیات بنانے کے لئے اس کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑنا دنیا کا ایک غیر
معمولی واقعہ ہی ہو سکتا تھا۔ اور افسوس ہے کہ یہ غیر معمولی واقعہ ظہور
میں نہ آسکا۔ یہ ضرور ہے کہ میرے ذہین۔ اور مالدار ہونے کی وجہ سے اس نے
اور میں نے امتحان کی تیاری میں ساتھ ساتھ مطالعہ کرنے کی اسکیم بنا کر

اس پر عمل کیا تھا۔ لیکن یہ کیا ضروری تھا کہ میں اس کے دل پر حکومت کر سکتا
وسنتی کا جواب سن کر میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ اور اسے برابر خط لکھتا
رہتا تھا۔ لیکن وہ ایسے خطوں کا کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ تین چار روز ہوئے
جب اس کی شادی ایک وجیہ نوجوان شانتا رام کے ساتھ ہو گئی! اور اب مجھے
جب یہ احساس پھر تازہ ہو گیا۔ کہ میں واقعی ”چڑی کا بادشاہ“ ہوں تو مجھ پر
ایک حوصلہ شکن اضطراب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ اب مجھے مل
نہ سکتی تھی۔ یہ اچھی طرح میں سمجھ چکا تھا۔ پھر اس گھبراہٹ اس بےچینی کی
وجہ ؟ سمجھ میں نہ آتی تھی۔

آج اضطراب کی اس شہرت اور گہرے سوچ بچار نے ایک اور ہی
خیال پیدا کر دیا تھا۔ جس کا ماحصل صرف یہ تھا کہ ایک عورت نے میری
توہین کی ہے۔ اب مجھے اس کی توہین کر کے یا تو انتقام لینا چاہیئے یا ڈوب
مرنا چاہیئے۔

اگر اس کے نزدیک میں ”چڑی کا بادشاہ“ ہوں تو میرے نزدیک وہ بھی
”سور کی بچی ہے“ حالانکہ اس کمبخت کو ”چڑی کی ملکہ“ بننا چاہیئے تھا۔
بس دل میں یہ چاہ رہا تھا کہ وسنتی سے کسی نہ کسی طرح یہ بات کہکر
اپنا دل ضرور ٹھنڈا کروں۔ اور یوں کہوں کہ

”اگر میں ”چڑی کا بادشاہ“ ہوں تو تو بھی سور کی بچی ہے“ اس خیال
میں بڑا سکون تھا۔ لیکن یہ کام کیسے انجام پاتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر

وہی اضطراب کا عالم طاری ہو گیا۔

موسم گرما کی ایک چاندنی اور فرحت بخش رات تھی۔ چاند نے اپنی نورانی اور ضیا پاش کرنیں چاروں طرف پھیلا کر اور فضا کو دھو دھلا کر حسین اور منور بنا دیا تھا۔ یکا یک رات کی اس خاموشی میں مخلل انداز ہوتے ہوئے شہر کے بڑے گھڑیال نے ایک بجنے کا اعلان کیا۔ میں نے عالم اضطراب میں اس ناول پر سے نظریں ہٹا لیں جسے میں کھولے ہوئے تھا لیکن پڑھ نہیں رہا تھا۔ اور چاروں طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہ جو کسی گمشدہ چیز کی جویا ہوتی ہیں ”میرا دل گھبرا رہا ہے“؟ لیکن کیوں؟ کیا اس لئے کہ میں چڑی کا بادشاہ ہوں۔ لاحول ولا۔ خواہ مخواہ کی پریشانی شادی ہو گئی تو ہو جانے دو۔ چڑی کا بادشاہ! اسود چڑی کا بادشاہ“! چڑی کے بادشاہ کے مستبد خیال سے گزر کر اس وقت میں اپنے گھر کے صحن میں پلنگ پر لیٹا ہوا۔ اپنی گزشتہ زندگی کے اعمالنامے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو نہ معلوم ایسے ماحول اور خیالات کی بے ربطی میں کہاں سے میرے دماغ میں داخل ہو گیا تھا۔

گھر کے تمام لوگ سامنے کی چھت پر اور برآمدوں میں پڑے سو رہے تھے۔ شفاف چاندنی رات میں ان کے بستروں کی سفید چادریں جو برابر چھ سات پلنگوں پر بچھی ہوئی تھیں۔ کچھ میت کے جنازوں کا سا منظر پیش کر رہی تھیں۔ میرے سرہانے ایک ہلکی روشنی کا برقی قمقمہ روشن تھا۔ اور ہاتھ میں ناول تھا گھر کے قریب ہی سامنے گرانٹ روڈ کا اسٹیشن تھا

غالباً گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ اس لیے لوگوں کو چیخ و پکار اور انجن کی سائیں سائیں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گھنٹا بجا۔ سیٹی ہوئی۔ اور گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی آہستہ آہستہ اس کی شور مچانے والی آواز بھی فضا کی وسیع اور لامحدود دنیا میں غائب ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد اسٹیشن کا شور و غل بھی کم ہوگیا۔ دور شہر کی گھڑیال نے دو کا گھنٹہ بجایا۔ گھنٹے کی آواز کسی بدنصیب بیمار کی کانپتی اور سسکتی ہوئی آواز کے مانند فضا میں مرتعش ہوئی اور غائب ہوگئی ۔۔۔ کیا بات ہے۔ کیا آج نیند نے بھی نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے۔؟" میں نے جُزبُز ہوتے ہوئے ناول کی طرف دوبارہ نظریں گاڑ کر کہا۔ مگر ناول کس سے پڑھا جاتا تھا۔ اس میں لکھے ہوئے حروف آنکھوں میں تاروں کی مانند ناچ رہے تھے اور ٹیڑھی آڑھی لکیریں معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور بیٹھ گیا۔ اور بالکل خالی الذہن بیٹھا رہا۔ پھر یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلیپر پہنے اور دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل آیا۔ شاید وسنتی کو "سور کی بچی" کہکر انتقام لینے کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ کتنا عجیب سماں تھا۔ میں نے سوچا اگر وسنتی میرے ساتھ ہوتی تو حسن و محبت کے سمندر میں کتنے طوفان آچکے ہوتے۔ مگر وسنتی کہاں تھی۔ اوہ تو اپنے پتی کی آغوش میں میٹھی نیند سو رہی ہوگی۔ اس نے میری محبت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے صرف اس لئے کہ میری صورت تاش

کے پتوں میں چڑی کے بادشاہ سے ملتی جلتی ہے۔

یہ سوچ کر مجھے غصہ آنے لگا۔ اپنے آپ پر نہیں تاش کے موجد پر کیونکہ نہ وہ چڑی کا بادشاہ بناتا اور نہ اب اس سے میری صورت ملتی یہ بے ربط خیالات میرے مضطرب سینے میں موجزن تھے۔ لیکن ایسے خیالات تو روز ہی آتے تھے۔ پر یہ خاص گھبراہٹ کیوں تھی۔!! میں شاید وسنتی سے اپنے سوچے ہوئے انتقام لینے کی تدبیر پر عمل کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

ہر چیز نکھری ہوئی اور حسین دکھائی دے رہی تھی۔ میں بے اختیار چاندنی کو چیرتا ہوا ہلکی رفتار سے اسٹیشن کی طرف بڑھا۔ سڑک پر آمد و رفت نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ چھیل چھبیلے اور الھڑ تمام شب میں گلیوں سے البتہ کبھی کبھی نکل آتے تھے۔

اسٹیشن کی عمارت سے گزر کر میں پلاٹ فارم پر جا پہنچا۔ اسٹیشن بالکل سنسان تو نہ تھا۔ لیکن دن کے ہجوم کے مقابلے میں کافی خاموشی تھی اس خاموشی اور اداسی نے مجھے مکدر اور فضا کو مہیب بنانا شروع کر دیا تھا میں نے سوچا اگر میں وسنتی سے یہ الفاظ یعنی "سور کی بچی" نہ کہہ سکا تو کیا ہوگا۔

بکھری ہوئی ریل کی پٹریاں چاند کی شفاف روشنی میں چمک رہی تھیں دور تک ریلوے لائن پر چاند کی سفید روشنی چھائی ہوئی تھی۔ ہاں۔ کبھی کبھی ریلوے ورکس کے کواٹر میں سے کسی کہنے کی

دردناک اور بھیانک آواز اس طلسم سکوت کو توڑ دیتی لیکن بعد میں وہی خاموشی اور اُداسی چھا جاتی۔

میں بے مدعا پلیٹ فارم پر گشت کرنے لگا اور ان اونچی اونچی عمارتوں کو دیکھنے لگا جو اسٹیشن کی دوسری جانب کھڑی تھیں اور سکوت شب میں بمبئی شہر کی مارواڑی اور پارسی سرمایہ داری کا ثبوت دے رہی تھیں یکسانیت کے اس تھکا دینے والے منظر سے بھی میں تھک گیا ایک انگڑائی لیکر میں نے کہیں اور جانے کی ضرورت محسوس کی۔ کہاں جانا چاہیے؟ بے مقصد ایک دو بجے رات کو کہیں جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ مگر بے مقصد کیوں ۔۔؟ مجھے تو وسنتی سے" چڑی کے بادشاہ کا انتقام" "سور کی بچی" کہہ کر لینا تھا۔ اس لئے میری منزل وسنتی کا مکان تھا۔ بس! واپس ہوتے ہوئے میں نے پھر ایک نگاہ اسٹیشن پر ڈالی۔ چمکتی ہوئی پٹریاں خاموش کھڑے ہوئے چند ڈبّے اور دور سگنلوں کی ٹمٹماتی ہوئی سرخ اور سبز روشنیوں کے سوا کچھ اور نظر نہ آیا۔ میں گوالیا ٹینک کے ارادے سے روانہ ہو گیا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں صحیح راستے پر چل رہا تھا یا نہیں لیکن اتنا معلوم تھا کہ شانتا رام کے ساتھ وسنتی گوالیا ٹینک کے ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔

راہ گیروں کی آمد و شد سے بے خبر ایک گھنٹے تک میں خدا جانے کن کن سڑکوں سے گزرا مگر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک ریلوے برج پر سے سڑک کے ڈھال کی جانب مغرب کی سمت منھ کئے اب میں چل

رہا تھا۔ اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو بڑی آسانی سے بتا سکتا ہوں کہ یہ برج تار دیو کا برج تھا۔ گویا لیار ٹیننگ کی بجائے میں تار دیو پہنچ گیا تھا۔ اور دماغ میں سوائے "چڑی کے بادشاہ" اور "سور کی بچی" کے کوئی دوسری بات نہ تھی۔ برج کے آخری سرے پر میں پہنچا تو ایک نامعلوم اور ناواقف آدمی نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بابوجی"۔ میں چونک پڑا آدھی رات گزر جانے کے باوجود اس نامانوس جگہ کون میرا ملاقاتی آگیا تھا۔ میں نے غور کیا تو آواز مانوس معلوم ہوئی۔ میں رک گیا اور پلٹ کر دیکھا تو گھر کے عین سامنے مغل کے ہوٹل کا باہر والا کھڑا ہنس رہا تھا۔ "کیوں کریم"

"کیا کر رہا ہے تو"؟

"جو آپ کر رہے ہیں بابوجی"۔

"میں کیا کر رہا ہوں ......؟" متعجب ہو کر میں نے پوچھا

پھر مجھے خیال آیا کہ کیا کریم کو بھی کسی نے "چڑی کا بادشاہ" کہہ کر اس کا دل توڑ دیا ہے۔ اور کیا وہ بھی کسی اپنی محبوبہ کو "سور کی بچی" کہنے کے لئے بے قرار ہے۔

"بابوجی" کریم نے اپنا منہ میرے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"بابوجی!" پل کے نیچے بائیں ہاتھ پر جو نئی سڑک بن رہی ہے۔ وہ دیکھئے لال بتی۔ بس وہیں ایک۔ پوری ایک درجن مہاراشٹر اور تلنگانے سے آکر ٹھیری ہیں ایک تو ان میں بالکل پٹاخہ ہے۔

بابوجی پٹاخہ ——— !"

"کیسا پٹاخہ"—— ؟

"بس آپ پوچھئے نہیں ——— چلئے میرے ساتھ"

اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اس سڑک پر لے گیا۔ اور لال بتی کے سامنے بلڈنگ پر جا کر کھڑا ہو گیا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کہ اس کے ساتھ جاؤں۔ لیکن غیر محسوس طور پر میں کوئی مدافعت نہ کر سکا۔ سامنے دروازے پر ایک دراز قامت نیم برہنہ کالی سی عورت جس کے منہ پر بہت سا پوڈر بے ڈھنگے پن سے تھپا ہوا تھا۔ اور گالوں اور ہونٹوں پر سرخی خوب رگڑ رگڑ کر ملی گئی تھی۔ ہمارے استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ وہ شاید سڑک پر جانے آنے والے ہر آدمی کے استقبال کے لئے وہاں متعین کی گئی تھی۔ اس کے باہوں تک کھلے ہوئے کالے ہاتھ اور پوڈر زدہ چہرہ، اس کی گردن اور سینے تک عریاں۔ کالا جسم کچھ عجیب قسم کی بھونڈی اور نسوانی آرائش کی بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں خاموش نیچے سڑک پر کھڑا ہوا تھا اور کریم اس عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ دو تین منٹ کے بعد کریم مسکراتا ہوا لوٹا اور مجھے بلڈنگ کے اندر چلنے کی دعوت دی۔ یہ حسن فروشی کا ایک پرائیوٹ اڈا تھا۔ نجانے میری خواہش تھی یا نہیں۔ لیکن میں اندر چلا گیا۔"

ایک بڑے ہال کے اندر صوفے پر کریم نے مجھے بٹھا دیا اور
کان میں رازداری کے ساتھ کہا "بابو جی۔ پسند کیجئے"
میں نے نظر اٹھائی تو سامنے کے دروازے سے کوئی ایک درجن
لڑکیاں۔ لڑکیاں اس لیئے کہہ رہا ہوں کہ اون کے رنگ برنگ
کے چمکیلے لباس اور بناؤ نے مجھے ان سب کو لڑکیاں کہنے پر مجبور
کر دیا۔ میرے سامنے آکھڑی ہوئیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ
سب کسی ممتحن کے سامنے آئی ہیں۔ میں ان کی جانب ایک بے معنی نظر جمائے
ہوئے تھا۔ لیکن میرے دماغ میں کوئی ارادہ نہ تھا۔ البتہ مجھے یاد ہے کہ اس
وقت اس ماحول ہیں میں اپنا بنیادی مقصد بھول گیا تھا مجھے خاموش
دیکھ کر کریم نے کہا۔
"کیوں بابو جی کوئی پسند نہیں! ہر ایک کی فیس رات بھر کی گیارہ
روپئے ہے اور مجھے جو چاہئے گا دیدیجیے گا۔
میں نے بولنے کی خواہش کے باوجود اپنے اوپر جبر کر کے کہا "
مجھے نہیں معلوم"
کریم ہنسنے لگا "اچھا بابو صاحب! آپ تکلف کرتے ہیں لایئے میں
آپ کے لئے پسند کر دوں ...."
اور یہ کہکر اس نے ایک طویل القامت، متناسب الاعضا لڑکی کی
طرف اشارہ کر کے کہا "رادھا۔ ! بابو جی کے ساتھ رات رہنا ہوگا
میں انھیں جانتا ہوں"

میں اور رادھا ایک چھوٹے سے کمرے میں جس کے اندر ایک قدآدم آئینہ، چند ننگی تصویریں۔ ایک بڑا پلنگ ایک چھوٹی سی میز اور ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ پہنچا دیئے گئے۔

تھکی ہوئی نگاہ سے میں نے کمرے کی ان چیزوں کو دیکھا اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ رادھا نے اپنی ساری اتار دی۔ خالی بلاؤز اور انڈرویر پہنے وہ آئینے کے سامنے میری جانب پشت کیئے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میری نظر آئینے پر پڑی۔ رادھا کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔ کوئی بھولی بات یاد آرہی تھی۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ رادھا کی صورت بہت کچھ وسنتی سے ملتی جلتی ہے۔ ...
وہ سچ مچ وسنتی ہے اور اسی خیال کے ساتھ پھر وہی "چڑی کا بادشاہ میرے حواس پر طاری ہوگیا۔

میں تیزی کے ساتھ اُٹھا اور جاکر رادھا کے ہاتھ پکڑ لیا جو ابھی تک بالوں کو سنوارنے میں مصروف تھی۔ دلربائی کے ایک مصنوعی انداز کے ساتھ رادھا نے مسکرا کر مجھ سے نظریں چار کیں۔ اور گردن مٹکا کر بولی ـــ "کیا ذرا بھی صبر نہیں۔ پہلے "بیر" کی ایک دو بوتلیں تو منگواؤ میں آج بالکل تھکی ہوئی ہوں ـــ"

میں نے اس کی بات سُنی ان سُنی کردی۔ میری سمجھ میں اس کا مطلب کچھ نہ آیا۔ میں کبھی ایسے اڈوں میں آج سے پہلے نہیں آیا تھا میں نے کہا "سنو جی! تم کہاں رہتی ہو ـــ؟

مُنہ پھیر کر اور مجھ سے قریب ہوتے ہوئے رادھا نے جواب دیا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کہاں رہتی ہوں ——— ؟ یہیں جہاں اب ہوں ——"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تھک کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رادھا میری اس حرکت سے کچھ متحیر سی ہو گئی اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی "کیوں بابو صاحب کیسی طبیعت ہے ——؟" "ٹھیک ہے"

جواب ملنے پر وہ توقع کے بالکل خلاف میرے زانو پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی پکڑ کر سر اونچا کر کے بولی "پیارے"

میرے سارے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا ہاتھ چہرے کے پاس سے میں نے ہٹا دیا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک برقی رو میرے سارے اعصاب میں دوڑا دی گئی ہے اور وسنتی بحالت عریانی میرے سامنے بیٹھی میری ناز برداری کر رہی ہے" میں نے رادھا کا ہاتھ پھر پکڑ لیا۔ اور اس سے نظریں ملا کر پوچھا۔

"بتاؤ میں کیسا معلوم ہوتا ہوں۔ ؟"

ذرا نخرے کے ساتھ رادھا نے کہا "کیسے معلوم ہوتے ہیں آپ۔ ایسے جیسے کہ۔ بادشاہ!"

"بادشاہ! کیسا بادشاہ؟ کیا چمڑی کا بادشاہ"؟

رادھا کھلکھلا کر ہنس دی "ہاں! ہاں! بالکل ٹھیک۔ "چمڑی کا بادشاہ"

"اور تم ---؟" میں نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔
مسکرا کر بڑے ہی انداز سے رادھا نے جواب دیا۔" اون ---
چڑی کی ملکہ --- چڑی کی رانی۔"
میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اور دوسرے ہی لمحے غیر ارادی طور پر
رادھا میری آغوش میں آگئی۔
میرا جواب مل گیا تھا۔

ساگر کنارے

از علیم پرویز۔ دہلوی

دریائے تاپتی کی اٹھتی ہوئی لہریں ساحل کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بیتابی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اور سورج دور افق میں تاپتی کے دوسرے کنارے کھنڈرات کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ کنارے کے ساتھ مچھیروں اور ملاحوں کے کچھ پکے مکانات تھے۔ اور ان کے پیچھے لق و دق میدان جہاں حد نظر تک سوکھی گھاس اور کہیں کہیں سبز درختوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ شام کے وقت ملاحوں اور مچھیروں کی عورتیں یہاں سے سوکھی لکڑیاں اکٹھی کر کے کھانے پکانے اور جاڑے کی طویل راتوں میں آگ تپانے کی غرض سے لے جائیں اور

وقت بھی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں دور۔ ان کچے مکانوں سے پرے
مجھے کچھ عورتیں حرکت کرتی ہوئی نظر آرہی تھیں جو شاید سوکھی لکڑیاں ہی
اکٹھی کر رہی تھیں۔

ملاح برسات کی سہانی راتوں میں لوگوں کو سیر و تفریح کی غرض سے
اس پار لے جاتے تھے۔ ان میں تو مشکل سے ہی کوئی اس پار جانے کے
لئے آتا تھا۔ ان کی مزدوری تو اکثر رات کو ہوا کرتی تھی اور وہ بھی خصوصاً
چاندنی رات میں جبکہ تاپتی کا منظر نہایت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر
دریا کے اُس پار دوسرے کنارے پر کچھ شاہی زمانے کی عمارتیں بھی تو
تھیں۔ عمارتیں ہیں بلکہ ان کے ڈھانچے، ہندوستان کے بالکل اُن
لاتعداد انسانوں کی طرح جن کے مردہ جسم قبرستان میں بے گور و کفن
ڈال دئے جاتے ہیں۔ اور چیل کوے جن کے گوشت پوست کو کچھ دنوں
میں نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ اور ان بے چاروں کی ہڈیوں کے
ڈھانچے صرف یہ بتانے کے لئے رہ جاتے ہیں کہ اس سرزمین پر ایسے
بھی لوگ پیدا ہوتے ہیں کہ جن کے پاس مرتے وقت اتنا پیسہ بھی
نہیں ہوتا کہ جس سے ان کی تجہیز و تکفین ہو سکے۔ یہی حال اب ان عمارتوں
کا تھا۔ وہ بھی زمانے کی کروٹوں میں پس کر رہ گئی تھیں۔ اور حکومت
کے نشہ میں چور، شہنشاہیت کے جذبہ میں مغرور چند انسانوں کے
ہاتھوں تباہ ہو گئی تھیں۔ اب ان کا کوئی پرساں حال نہ تھا۔
اس وقت بھی یہ کھنڈر مجھے کچھ دھندلے دھندلے نظر آرہے

سامنے جل کی طرف سے ایک کشتی سطح آب کی چھاتی کو چیرتی ہوئی ساحل کی طرف آرہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ کشتی کنارے پر آگئی۔ اس کشتی کا ملاح ایک بوڑھا شخص تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"واپس چلو گے"

"جی...... چلنے میں تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن بھوک بہت زور کی لگی ہے۔ اور پھر وہ بھی بھوکی بیٹھی ہوگی"

اس نے کشتی کے چپوؤں کو پانی سے نکال کر کشتی میں رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کون"

میں نے پوچھا۔

"جی...... کوئی نہیں وہی سارلا میری لڑکی ہے جی...."

اور پھر وہ میرے پاس آن کر کھڑا ہوا اور اپنی دھوتی کو ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

"بات دراصل یہ ہے جی کہ ابھی دو ماہ ہوئے کہ اسکی ماں مرگئی اب ہم دونوں کو کھانے پینے کی بہت تکلیف ہے۔ سارلا کھانا پکانا نہیں جانتی۔ سارلا کی ماں اس سے بہت محبت کرتی تھی مرتے دم تک اس سے اس نے کوئی کام نہیں لیا۔ اور صاحب مجھے بھی اس کی ماں سے بہت محبت تھی۔ لیکن اس ایشور کے نہ معلوم کیا ہاتھ آیا کہ اسے مجھ سے چھین لیا۔ اور ــــ جی جب سے وہ مری ہے سچ پوچھو تو میرا ایشور پر سے اعتقاد جاتا رہا۔

وہ باتیں کرہی رہا تھا کہ ایک لڑکی کوئی اٹھارہ انیس برس کی بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ بوڑھا ملاح اسے دیکھکر مسکرا دیا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"مچھی کہاں ہے بابا"

"کشتی میں ہے لے آ"

وہ کشتی کی طرف دوڑی کہ اتنے میں ایک سیٹھ صاحب بمعہ چند آدمیوں کے بوڑھے ملاح کے پاس آئے ان کے ساتھ ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا تھا۔ سیٹھ صاحب نے بھی ملاح سے وہی سوال کیا۔ اور ملاح نے وہی فقرہ جواب میں دُہرا دیا۔

"جی .... چلنے میں تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن بھوک بہت زور کی لگی ہے"

سیٹھ کو بہت ضروری کام تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے ناشتہ دان میں سے اچھا خاصا کھانا نکال کر سار لا اور اس بوڑھے کے آگے رکھ دیا وہ دونوں کھانا کھاتے رہے اور ہم سب اتنے کشتی میں جاکر بیٹھے تھے کہ اتنی دیر میں وہ دونوں بھی کھانے سے فارغ ہوکر کشتی میں آن بیٹھے بوڑھا کشتی کھینے لگا۔

کشتی پانی پر آہستہ آہستہ بہنے لگی وقت کافی ہوچکا تھا۔ کھنڈرات کے پیچھے سے چاند اُبھر رہا تھا۔ بوڑھا اپنے نحیف ہاتھوں سے برابر چپو چلا رہا تھا۔ چاند کی اٹھتی ہوئی کرنیں دریائے تاپتی کے وسیع پانیوں کی

سطح پر آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ اور کشتی میں مسافروں نے اونگھنا شروع کر دیا تھا۔ سارلا بھی کشتی میں ایک تختے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسکی آنکھیں بند تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ سوتے سوتے مسکرانے لگتی تھی۔ جب کشتی کا رخ بدلتا اور چاند کی کرنیں اس کے چمپئی رخساروں کو چومنے لگتیں تو ایک ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگتا۔ اور مجھے ایسا احساس ہوتا گویا وہ سپنوں کی ٹھنڈی چھانوں میں اپنے محبوب کے پاس بیٹھی اس سے شکایت کر رہی ہے لیکن اس کے پیار کرنے سے اس کا تمام غصہ دور ہو جاتا ہے اور وہ مسکرانے لگتی ہے۔۔۔ اور میں نے دیکھا کہ سارلا کے ہونٹ مسکراہٹ کی وجہ سے کچھ پھیل گئے ہیں۔ اور وہ کچھ اس طرح ہنس رہی ہے جیسے خواب میں اس کا محبوب اس کے رخسار چوم رہا ہو۔ لیکن پل بھر میں اس کے پھیلے ہوئے ہونٹ سکڑ گئے۔ اور اس کا مسکراتا ہوا چہرہ کمھلا گیا۔ اور وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ جیسے کسی نے اسکے پیار کرنے والے کو اس سے چھین لیا ہو۔

دریائے تاپتی کے وسیع پانیوں پر بکھری ہوئی چاندنی اور اس کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہونے لگی اور پھر میں اس درخت کے اس جھنڈ کو دیکھنے لگا جہاں تاپتی کا پانی کالے کالے پتھروں کے درمیان چمک رہا تھا۔ اور چاند کی کرنوں نے درختوں میں سے گزر کر پانی پر ان مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے جو پانی میں

آزادی سے تیر رہی تھیں۔ جال ڈال رکھا تھا۔ ان ہی درختوں کے نیچے کالے کالے پتھروں میں چمکتے ہوئے پانی کے پاس مجھے دو مدھم سی صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ ہماری کشتی اس جھنڈ کے قریب ہو تی جا رہی تھی۔ فضا میں مکمل خاموشی تھی۔ اور میں نے سنا کہ کوئی ان ہی درختوں کے نیچے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

پیاری .... اس دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھو کیا یہ یوں ہی تیزی سے دھڑکتا رہے گا .... مجھ کو اتنا نہ ترساؤ۔ روما .... بشکستہ دل ہوں .... یہ چاندنی راتیں میرے لئے قیامت خیز ہیں .... جب سے تم گئی تھیں ان نینوں میں نیند نہیں آئی .... اور آج کی رات میرے لئے کتنی اچھی ہے

آواز ختم ہو گئی اور پھر فضا میں ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی میں نے محسوس کیا جیسے اس نے اوما کا منہ چوم لیا ہو تھوڑی دیر بعد کسی نے نسوانی آواز میں کہا۔

"شرم نہیں آتی آپ کو"۔

اور اس کے بعد ان میں آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں وہ اب کچھ اس طرح باتیں کر رہے تھے۔ جیسے بہت دن کے روٹھے ہوئے آپس میں ملے ہیں۔ جب ہماری کشتی درختوں کے جھنڈ کے نیچے سے گذر کر کچھ آگے پہنچی تو میں نے سنا کہ وہ مرد کہہ رہا تھا۔

"اوما .... کل اس وقت یہیں ساگر کنارے"۔

کشتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اور آوازیں دور ہو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ آوازیں پانی میں گھل گئیں۔ اور میں سوچنے لگا۔ کیا واقعی ان چمکیلی خنک راتوں میں خفتہ جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور دل میں ایک میٹھا میٹھا اور پرکیف درد ہونے لگتا ہے۔ میں نے سارلا کی طرف دیکھا وہ آنکھیں بند اس وقت بھی مسکرا رہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے مسکراتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ اور مجھے سیٹھ صاحب کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہہ رہے تھے۔

"حرامزادہ کہیں کا"

اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی چھتری اُٹھائی۔ اور اس پندرہ سولہ سالہ لڑکے کے سر پر زور سے کھینچ ماری۔ جو ان کے پیروں میں سو رہا تھا۔ لڑکا یہ فقرہ سن کر اور سیٹھ کی مار کھا کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"اب تو کہہ کر دیکھ .... زبان باہر نکال دونگا"

اور اتنا کہہ کر اس نے فوراً سیٹھ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا تین چار طمانچے زور سے سیٹھ کے رخسار پر رسید کئے اور واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ سیٹھ صاحب کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ اور لڑکا اپنی جگہ بیٹھا ایک وحشیانہ ہنسی ہنسنے لگا۔ اور ہنستے ہنستے پھر گھوڑے کی طرح ہنہنانے لگا چاندنی میں اس کے سفید دانت اس کے کالے چہرے پر چمک رہے تھے سیٹھ صاحب سے نہیں رہا گیا کہنے لگے۔

"اے ابلق کے بچے .... مُنھ بند کر .... سالے حیوان کہیں کے

کسی شریف آدمی پر ہاتھ اُٹھانا بدمعاشوں کا کام ہے۔ کمینے اتنا بھی نہیں جانتے۔"

اتنا کہہ کر انھوں نے اپنی آنکھیں اس لڑکے پر گاڑ دیں اور دیر بعد رک کر بولے۔"چل .... نہ پولیس کے حوالہ کیا ہو...... سمجھتے ہیں ہم غنڈہ بازی سے شریفوں کو دبا لیں گے۔ جانتا ہے تو...... میں سیٹھ ہوں ......سیٹھ اور یہ چار نوکر ہیں۔ جو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔"

اور اتنا کہہ کر انھوں نے ایک، دو، تین، چار کہہ کر اپنے چار نوکر گنوادئے جواب بیٹھے سیٹھ کی پنڈلیاں دبا رہے تھے۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"چیز یہ ہے جی کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا یہ تو میں ہی تھا جو چپ ہو گیا۔ اور جی بات بھی معمولی تھی میں پڑا سو رہا تھا۔ اتفاقیہ میرا پاؤں اس کے سر سے چھو گیا ہوگا۔ سفر میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اس چھوکرے نے اس زور سے دبایا کہ بس جان نکل گئی۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ اگرچہ اس لڑکے کی تعلیم و تربیت اچھی دی جائے تو یہ ایک بہت اچھا لیڈر بن سکتا ہے۔" گاندھی اور جناح سے بھی بہتر — ہندوستان کو در اصل ضرورت ایک ایسی ہی نسل کی ہے جس کے سینہ میں سرمایہ داروں کے خلاف ایک مسلسل آگ بھڑک رہی ہو۔ ایسے بچوں کی جنھیں شروع ہی سے غلامی کا احساس ہو اور جو

سرمایہ داری اور محکومیت کو ایک لعنت سمجھتے ہوں۔

یہ سوچتے سوچتے میں نے اپنے ماحول پر نگاہ ڈالی۔ چاند بیچ آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ اور ہم سب چاندنی میں نہا رہے تھے۔ سارلا اب میرے قریب آن بیٹھی تھی۔ اور آسمان پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے منہ سے کبھی کبھی ہلکے سے ایک آہ سرد نکل جاتی تھی۔ جیسے تخیل میں اب اس کا محبوب آسمان پر تاروں کی طرح چمک رہا ہو۔ جس کو دیکھ کر وہ کبھی شرماتی اور کبھی مسکراتی ہیں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کے بالکل قریب رکھا تھا۔ میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ میں اسکا ہاتھ اُٹھا کر چوم لوں۔ اور ایک ایسی ہلکی ہی سی آواز اس خاموش فضا میں پیدا ہو جائے۔ جیسی کہ اس درختوں کے جھنڈ کے نیچے سے پیدا ہوتی تھی جب کسی نے "اوما" کا مُنہ چوم لیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میری یہ خواہش اور بھی زیادہ تیز ہو گئی۔ اور میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ اُٹھا کر چومنے ہی والا تھا کہ بوڑھا بولا۔

سارلا۔ لے تھام یہ چپو میں کشتی اوپر گھسیٹتا ہوں"۔ اور سارلا نے اپنا ہاتھ وہاں سے اُٹھا لیا۔ میں ناامید ہو کر اُن کھنڈرات کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں ایک دفعہ یہ سوشیلا سے ملا تھا۔ اور اُس آواز کی طرح جو درختوں کے جھنڈ کے قریب سے گذرتے ہوئے میں نے سنی تھی میں نے بھی ایک دن سوشیلا سے کہا تھا۔

"سوشیلا ...... کل اسی وقت یہیں ساگر کنارے، میں نے سارلا

کو الوداعی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھنڈرات کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن اسی طرح جیسے وہ وہاں کچھ ڈھونڈھ رہی ہو کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ میں کشتی سے اتر کر کھنڈرات کی طرف چلدیا۔ جہاں میں اکثر پاکن کی پشت پر بیٹھ کر روزانہ سوشیلا کا انتظار کرتا تھا۔ اور رات بھر انتظار کر کے صبح لوٹ آتا تھا۔ راستے میں ٹوٹی ہوئی اور بوسیدہ دیواروں سے عجیب ہیبت ٹپک رہی تھی مجھے کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ یکایک کسی نے میرے آنکھوں پر پیچھے سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بتلایئے ہم کون"

میں نے خیال کیا اتنی رات گئے ان کھنڈرات میں سوائے مجھ جیسے دیوانوں میں سیٹھ جیسے بے فکروں اور سارلا جیسی متلاشی ہستیوں کے اور کون ہو سکتا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا سوشیلا کا چھوٹا بھائی کھڑا مسکرا رہا تھا میں نے کہا۔

"تم"

"ہاں۔ بہن جی بیمار ہیں وہاں لیٹی ہیں"

میں گھبرا کر اُدھر گیا میں نے دیکھا کہ سوشیلا پتھروں پر لیٹی ہے اس کی آنکھیں بند ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ اور سانس تیزی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ایک موٹا بے ہنگم سا آدمی اس کا سر اپنے زانوؤں پر لئے بیٹھا ہے۔ میرے منھ سے بیساختہ نکلا۔

"سوشیلا، یہ کیا ہوا تمھیں"

اس نے آنکھیں کھولدیں اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ اس طرح جیسے

وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور پھر اس نے کہا۔

"میں آگئی ستیش۔ تم میرا ہی انتظار کر رہے تھے نہ" اور پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کمزوری کی وجہ سے وہ لڑکھڑا گئی میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں لے لیا۔ اس نے کھانستے ہوئے کہا۔

"ستیش معاف کرنا میں نے تم کو بہت انتظار کرایا۔ بات دراصل یہ ہی ہوئی کہ میری شادی ان کے ساتھ کر دی گئی۔ اس نے اس موٹے بے ہنگم سے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو تیوری پر بل ڈالے سوشیلا کو دیکھ رہا تھا۔)

یہ بہت مالدار ہے۔ کئی کارخانے ہیں۔ ان کے پتا جی نے مجھے بیاہتے ہوئے کہا تھا۔ کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ایسی جگہ کر رہا ہوں جہاں وہ سکھ سے رہ سکے گی۔ لیکن (اور اس کے بعد اسے کھانسی اٹھنے لگی اس نے کھانستے کھانستے میرا ہاتھ اپنے بخار سے جلتے ہوئے ہاتھ میں پکڑ لیا۔) لیکن میں ان کے ہاں ایک منٹ بھی آرام سے نہ رہ سکی۔ تمہاری محبت کے گہرے گہرے زخم ناسور بن کر رسنے لگے میرا دل چاہتا تھا ستیش کہ میں کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ جاؤں لیکن سماج کے پنجڑے کی آہنی تیلیاں نہیں توڑ سکی بلکہ اس کوشش میں میں نے اپنا ہی سر لہولہان کر لیا۔ دل تمہاری یاد میں تڑپتا تھا اور دم اٹکا پھرتی تھی۔ آخر کار اسی کشمکش میں بیمار رہنے لگی رفتہ رفتہ دق ہو گئی۔ آج بڑی منت سماجت سے یہاں لائے ہیں۔ مجھے یقین

تھا کہ تم روزانہ میرا یہاں انتظار کرتے ہوئے لیکن ستیش میں مجبور تھی مجھے معاف کر دو۔

"ایسا نہ کہو سوشیلا۔ تم اچھی ہو جاؤ گی میں اب تمھیں نہ جانے دوں گا۔"

"نہیں ستیش اب میری زندگی ختم ہو گئی میں اپنا وعدہ پورا کرنے آئی تھی۔"

اسے کھانسی اٹھنے لگی۔ سانس اور بھی تیزی سے چلنے لگا میں نے زمین پر اپنا کوٹ بچھا کر اسے لٹانا چاہا لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے مجھے روک دیا۔

"آخری سانس تو اپنی آغوش میں توڑ لینے دو ستیش۔"

اس کے چند لمحوں کے بعد اس کا سانس رک گیا۔ اور وہ بے حس و حرکت میری گود میں پڑی رہ گئی۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ کسی نے ایک حسین عورت کا مرمریں مجسمہ میری گود میں ڈال دیا ہو۔ ستیش کا چھوٹا بھائی اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ اور سوشیلا کا خاوند اس بوڑھے ملاح سے کہہ رہا تھا کہ میری بیوی مر گئی ہے اسے تم اس کشتی میں اگر اس پار چھوڑ آؤ گے تو میں تم کو پانچ روپئے دونگا۔

اور پرے...... کوئی ملاح اپنی کشتی میں سوار گاتا جا رہا تھا۔

آتے جاتے رہنا..........

پردیسی بابو........

آتے جاتے رہنا...........

اس کی درد میں ڈوبی آواز چاند کی چمکیلی کرنوں پر پھیلتی ہوئی کھنڈرات کے شکستہ اور بوسیدہ درو دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی میں ساگر کے کنارے جو کبھی ایک تارہ چمکا

تھا وہ آج نہیں...... ساگر کنارے افق زندگی سے ٹوٹ کر پانی میں گھل مل گیا۔

وَلوَرُ

(از کمال گڑیانوی کوئٹہ (بلوچستان))

موسم بہار کا آغاز تھا۔ بادام۔ زرد آلو۔ آلوچے کے درختوں کے پھول جھڑ چکے تھے۔ ہری ہری پتیاں پھوٹ رہی تھیں۔ بلوچستان کی پتھریلی زمین، جہاں چشموں اور کاریزوں کی چھوٹی چھوٹی نالیاں سطح زمین پر بہتی ہیں۔ ان کے دونوں طرف خودرو گھاس کی متوازی پگڈنڈیاں پہاڑوں کے دامن سے نکل کر میدانوں میں آکر ہرے ہرے گندم کے کھیتوں میں گھستی ہوئی گم ہو جاتی ہیں۔ جیسے ندی نالے دریا میں ڈوب جائیں۔

اور۔ پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی سی گلی (گانوں) آباد ہے جس کا نام شہرہ ہے۔ ڈھائی تین سو آدمیوں کی آبادی۔ سوائے دس بیس چرواہوں کے، سارے زراعت پیشہ لوگ۔ کچے مکان جو چکنی مٹی اور پہاڑوں کے گول پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے بچوں کے سے گھروندے دکھائی دیتے ہیں۔

ہر چہرہ بشاش۔ بظاہر ہر جگہ مسرت بچوں کا ایک۔ دروازے سے ہنستے ہوئے نکلنا اور بھاگ کر دوسرے میں جا گھسنا۔ چلتی پھرتی سی گھڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ خوشی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔

جس گاؤں کی فضائیں مسرت بار تھیں۔ وہاں انسانی دل کی تیز تیز

دھڑکنیں۔ سُست نبضیں۔ زرد چہرے۔ میلے کچیلے چیتھڑوں کی کچی بو۔
گرد آلود بازو۔ چہروں کی جھریاں بھی ایک دور رس نظر رکھنے والے
انسان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔

اس مختصر سے گانوں کے عین وسط میں ایک چوڑی سی گلی ہے
جس کے دونوں طرف کچی مٹی اور پہاڑوں کے گول گول پتھروں سے
لمبے لمبے چبوترے بنائے گئے ہیں۔ اور اُن کے اختتام پر ایک طرف اب
بھی بنیئے کی دوکان ہے۔ اور دوسری طرف گاؤں کی مسجد۔

گرمیوں میں شام کے وقت غریب امیر جوان اور بوڑھے کام کاج
سے فارغ ہو کر یہاں آ بیٹھتے بچے کھیلا کرتے۔ یا کوئی گانوں کا
آدمی شہر ہو کر آتا۔ کسی اخبار بیچنے والے کی زبانی مختصر خبریں جو اخبار
بیچنے والے عموماً دلکش انداز میں سناتے ہوئے اپنے اخبار کی خریداری
کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں، سب کو سناتا۔ سب غور سے سنتے
کافی دیر سوچتے۔ بحث کرتے۔ اور سردیوں میں جس روز سورج نکلتا۔ صبح
دوپہر، شام کوئی وقت ہو۔ گاؤں کے بچے، بوڑھے، اکّا دکّا جوان اور
فارغ از کار لوگ یہاں بیٹھے نظر آتے۔

گاؤں کی اس اہم جگہ کو چوپال کہئے۔ بچوں کے کھیلنے کا میدان۔
یا عدالت۔ عدالت اس لئے کہ گاؤں کے چھوٹے موٹے قضیئے اور شکر رنجیوں
کے فیصلے گاؤں کا ملک (نمبردار) یہیں بیٹھ کر طے کر دیا کرتا ہے۔ ان کے
علاوہ۔ دُنبے، بکری۔ بیلوں اور کھیتوں کی پیداوار کے متعلق لین دین

کی باتیں یہیں طے ہو جایا کرتی ہیں۔

موسم بہار کی ایک شام عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے لوگ نکلتے۔ گاؤں کا ملک اللہ داد۔ آگے آگے۔ اس کے پیچھے تور خاں اور پھر کچھ اور لوگ سب سے پیچھے عمر خاں اور رحیم داد تھے۔ عمر خاں نے مسجد کے دروازے سے نکلتے ہوئے اپنے دوست رحیم داد سے کہا۔

"ملک کے ساتھ تور خاں بھی جا رہا ہے۔ خیال تو یہی ہے کہ وہ دونوں چوپال میں بیٹھیں گے۔ اب موقعہ ہے تم کہہ ڈالو"

"بات تو ٹھیک کہتے ہو" رحیم داد نے جواب دیا۔

"ان کو وہاں جاکر بیٹھ جانے دو۔ ذرا آہستہ چلو"

ملک اور تور خاں شمالی چبوترے پر پاس پاس بیٹھ کے باتیں کرنے لگے اتنے میں رحیم داد اور عمر خاں اُن کے پاس پہنچے اور ملک کے پاس خالی جگہ پر سلام کرکے رحیم داد بیٹھ گیا اور عمر خاں سلام کرکے رحیم داد کے پاس کھڑا رہا۔ ملک نے عمر خاں کا سلام لیتے ہوئے حسب معمول مزاج پُرسی کے بعد رحیم داد سے پوچھا۔

"تمہارا لوسن کیسا ہے؟"

"لوسن تو بہت اچھا بڑھ رہا ہے" رحیم داد نے جواب دیا "مگر فصیل کی نہ پوچھئے اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اس دفعہ سب سے پہلے میں کاٹوں گا"

"اور کوئی خبر" ملک نے پوچھا۔

رحیم داد نے کہا "اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے مگر خوش قسمتی سے آپ بھی اور کاکو تور خاں دونوں بیٹھے ہیں۔ میں نے جو کل عمر خاں کے متعلق کہا تھا"

ملک عمر خاں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے تورخاں کی طرف گردن موڑی اور کہا۔

"ہاں ہاں تورخاں سے میں نے کل ذکر کیا تھا۔ مگر مجھے شہر جانا تھا۔ اس لئے بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ہاں بھئی تورخاں اب تم بتاؤ عمر خاں بھی یہیں ہے کیا کہتے ہو اپنی لڑکی کے رشتے کے متعلق؟"

تورخاں نے نسوار کی چٹکی منہ میں دابتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب آپ کی بات تو میں ٹال نہیں سکتا۔ مگر عمر خاں وَلوَر (روپیہ جو لڑکی کے عوض بلوچستان میں لیا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے) ادا نہیں کر سکے گا" تورخاں نے عمر خاں کی طرف سے ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رحیم داد بولا۔

"آخر آپ بتائیں تو سہی کاکو۔ آپ کیا ولور لینا چاہتے ہیں؟"

تورخاں نے نسوار تھوکتے ہوئے کہا۔

"دو ہزار روپئے نقد۔ دس دنبے اور تین من چاول اور کم از کم پانچسو روپے کے کپڑے زیور۔ تقریباً تین ہزار روپیہ کل" تورخاں یہ الفاظ اس طرح کہہ گیا کہ جیسے برسوں پہلے اُس نے خوب سوچ کر یاد کر رکھے تھے۔ عمر خاں گھبرا گیا اور وہ چاہتا تھا کہ کچھ کم کیا جائے۔ اس رقم میں سے رحیم داد عمر خاں کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ یہ بھانپ کر کہ عمر خاں کیا چاہتا ہے اور تورخاں اپنی لڑکی کا یہ ولور مقرر کر کے ہرگز ایک پائی بھی کم نہیں کرے گا۔ عمر خاں کی طرف مایوسی کے انداز میں دیکھنے لگا۔

مگر عمر خاں یہ سمجھتے ہوئے کہ ولور واقعی بہت زیادہ ہے مگر شادی ضرور کرنی ہے۔ اور اس ولور سے کم میں کوئی بیوی نہیں مل سکے گی۔ ایک گہرا اور لمبا سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"اچھا"

رحیم داد نے عمر خاں سے آہستہ سے پوچھا

"پھر وہ رقم کل ان کو دے دوں"

"ہاں۔ دے دینا۔ مگر بات پکی کر لو"

عمر خاں نے کہا۔

رحیم داد نے ملک اور تور خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ملک صاحب اور کاکو تور خاں ولور تو مقرر ہو گیا۔ مگر عمر خاں یکمشت ادا نہیں کر سکے گا۔ دو تین دفعہ میں پورا کر دے گا"

"یہ بات ٹھیک ہے" ملک نے کہا۔ اور تور خاں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ تور خاں بولا۔

"ایک مشت ادا کر دے تو کوژدہ (منگنی اور نکاح کی رسم۔ رخصت بعد میں ہوتی ہے)۔ اور شادی ابھی کر دوں گا۔ اگر دو تین بار میں ولور ادا کرے گا تو میں کوژدہ ابھی نہیں کروں گا سمجھے۔

رحیم داد نے کوژدہ کے لئے بہت اصرار سے کہا۔ مگر کاکو تور خاں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بدلے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ ضدی تھا۔ اپنی ضد پر قائم رہا۔ مجبوراً عمر خاں معاملہ طے کرنے کے خیال سے بولا۔

"اچھا زبان ہوئی۔ میں یہ رقم اور کپڑے زیور کے بدلے بھی روپئے یعنی تین ہزار روپیہ تین قسطوں میں دے دوں گا۔

عمر خاں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب چونکہ میری عمر چالیس سال کے قریب پہنچ

چکی ہے۔ دوسری جگہ رشتہ ملنے میں خدا جانے اور کتنے دن لگ جائیں۔ کوئی اپنی لڑکی دینے پر رضامند ہو یا نہ ہو یہ ہی بہتر ہے۔ اب ہاں کر لی جائے۔

"نور خاں نے کہا"

"مگر اب کیا دو گے؟"

"عمر خاں نے کہا"

"کل پانسو روپئے دے دوں گا"

"یہ سن کر ملک نے کہا۔ "چلو فیصلہ ہوا"

پاس کی مسجد سے مغرب کی اذان کانوں میں گونجی اور سب نماز پڑھنے چلے گئے۔

عمر خاں نے پانسو روپئے کی رقم دوسرے دن کاکو نور خاں کو دیدی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ کونسے ذریعے سے روپیہ حاصل کیا جائے اس کی زمین جس میں ابھی ابھی انگور کا باغ لگایا گیا تھا۔ اس قدر تھوڑی تھی کہ سارے ولور کا روپیہ تو کجا دسواں حصہ بھی مشکل سے قیمت ملتی اُس نے یہ سوچ کر کہ شادی کے بعد بڑھاپے میں یہی ٹکڑا زمین کا گزر اوقات کے لیئے کافی ہو گا۔ زمین بیچنے کا خیال بالکل ذہن سے نکال دیا۔ اب دوسرا راستہ اُس کے سامنے یہ ہی تھا کہ شہر میں جا کر مزدوری کرے اور روپیہ کمائے۔

ایک صبح چالیس سال کی عمر میں سینے میں دھڑکتا جوان دل لئے۔ ادھیڑ عمر کا نوجوان اُٹھا۔ اور اپنا مختصر سا بستر لیئے سڑک پر جو کوئٹہ کی طرف جا رہی تھی تیز گامی سے چلتا ہوا نظر آیا۔

عمر خاں کے ذہن میں آئندہ شاندار زندگی کی تصویر تھی۔ محنت

مزدوری۔ روپیہ کمانا۔ دلور ادا کرنا۔ شادی۔ زینت گل۔ کاکو تورخاں کی خوبصورت جوان لڑکی۔ خوبصورت بیوی۔ شادکام زندگی بچے۔ مسرت۔ ہر طرف شادمانی۔ شادکامی۔

وہ چلتا رہا۔ اور سورج غروب ہونے سے ذرا پیشتر کوئٹہ کے عین وسط میں ایک چوڑی سڑک پر گزر رہا تھا۔

اس سے پیشتر وہ بارہا یہاں آچکا تھا۔ کوئٹہ اُس کے لئے نیا شہر نہیں تھا۔ مگر آج اُسے یہاں کی ہر چیز نئی نظر آرہی تھی۔ سڑکیں نئی۔ بازار نئے۔ لوگ نئے۔ بجلی کے قمقمے نئے۔ موٹر۔ بائیسکل۔ تانگے۔ ہر صورت نئی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کی خیالی تصویر پر مسکراتا چلا جا رہا تھا۔

عمر خاں کو دوسرے دن لکڑ منڈی میں لوگوں نے ایک مزدور کی حالت میں دیکھا۔ اور اس کے ایک سال بعد بھی وہ مزدور ہی تھا مگر اب اُسے لکڑیاں اپنی کمر پہ لاد کر لوگوں کے گھر نہیں پہنچانی پڑتی تھیں۔ اُس نے ایک گاڑی خرید لی تھی۔ اور وہ ایک بار میں ایک من لکڑی جس کے عوض چھ سات پیسے ملتے تھے۔ اب کمر پر نہیں اُٹھاتا تھا بلکہ آٹھ دس من لکڑیاں ایک ہی بار گاڑی میں ڈال کر کھینچ لے جاتا تھا۔ اس طرح چار چھ پیسوں کے بدلے دس بارہ آنے اُسے مل جاتے تھے۔ اور دن میں چار پانچ روپے کما لیتا تھا۔

انتہائی مدارج پر پہنچکر واقعی جنوں بن جانے والی روحانی تشنگی جو دم بدم تیز ہوتی جاتی ہے۔ انسان اس کے زیر اثر از خود رفتہ ہوجاتا

ہے۔ اور سوائے ایک مرکز تمنا کے سب پس و پیش بھول جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا مقصد پورا ہو۔ کیونکر ہو؟ کیسے ہو؟ پرواہ نہیں اور یہ ہی حالت عمر خاں کی تھی۔ اس کے سامنے ایک مقصد تھا۔ روپیہ جمع کرنا اور کاکو تور خاں کی لڑکی زینت گل سے شادی کرنا اور بس۔

اُس نے ساڑھے تین سال کے عرصے میں جو کچھ جمع کیا وہ کاکو تور خاں کے سامنے دو ہزار روپیوں کی صورت میں لے جاکر رکھ دیا۔ اب صرف پانسو روپئے اُسے اور ادا کرنے تھے۔ کاکو تور خاں نے اور تاکید کر دی تھی۔ کہ باقی پانسو روپے جلدی ادا کر دئے جائیں تو اچھا ہے یہی دس گیارہ ماہ تک۔

گزرنے کو ساڑھے تین سال آرام سے گزر گئے تھے۔ مگر پانسو روپئے کمانے کے لئے دس گیارہ مہینے کا عرصہ عمر خاں کو ایک پہاڑ سا نظر آرہا تھا۔ وہ واپس کوئٹہ جاتے ہوئے سوچتا جا رہا تھا۔ کہ کاش کوئی ایسی تدبیر ہو سکے کہ یہ رقم دس گیارہ ماہ کی بجائے کل ہی میسر ہو جائے مگر لکڑیاں گاڑی میں ڈال کر لوگوں کے گھر تک پہنچانے کے سوا وہ اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ نہایت تندہی سے وہ پھر ایک بار۔ اور آخیری بار پانسو روپیہ کمانے میں مصروف ہو گیا۔ اور لگاتار مزدوری کرتا رہا۔

سردی کا خوفناک موسم شروع ہو چکا تھا۔ جنوری کا مہینہ بلوچستان میں۔ پھر کوئٹہ شہر میں۔ برف باری شروع تھی۔ مغربی تند و تیز ہوائیں تیر کی طرح ہر جاندار جسم میں سے پار ہونا چاہتی تھی۔ کوئی گھر یا محلہ خالی

نہ تھا جہاں بخار اور نمونیہ کی شکایت نہ ہو۔ ہاتھ پاؤں کے ساتھ لوگوں کے دل بھی ٹھٹھرے جاتے تھے۔ مگر عمر خاں چوالیس سال کی عمر میں بھی اپنی رگوں میں جوانی کی گرمی اور اُبچ محسوس کر رہا تھا۔ اُسے یہ ہوا۔ یہ نکیلی تند ہوا کیف آگیں محسوس ہو رہی تھی۔ مگر موسمِ سرما کی ستم ظریفی اُس پر ہنس رہی تھی۔

کل عمر خاں کو لکڑ منڈی سے دس گیارہ بار شہر اور چھاؤنی میں آنا جانا پڑا تھا۔ اس وقت جبکہ لوگ گھروں کی کھڑکیاں۔ دروازے اور روشندان تک بند کئے آگ کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ یا نرم روئی دار یا اونی گدیلوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ عمر خاں برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں کو روندتا ہوا شہر اور چھاؤنی کی کئی سڑکوں پہ اپنی گاڑی کے دونوں پہیوں کی متوازی لکیریں جو آپس میں کبھی نہیں ملتیں بنا چکا تھا۔

آج صبح ہی سے وہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جسم گرم تھا۔ اُسے بخار تھا۔ تیز بخار۔ کھانسی اور سینے کا درد۔ باوجود اس تکلیف کے وہ آج بھی حسبِ معمول مزدوری اور محنت کا ارادہ کئے ہوئے تھا مگر کھانسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور بدن ٹوٹ رہا تھا۔ بخار اُسے کئی بار پہلے بھی ہوا تھا مگر اس قدر ہمت شکن نہ تھا۔ جتنا اُسے آج محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ نمونیہ تو نہیں ہو گیا۔ اُس نے کھانسی کے ساتھ مُنہ سے خارج ہونے والے بلغم کو دیکھا۔ بلغم میں سرخی کا ڈورا موجود تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ شاید آنکھیں دھوکہ دے رہی ہوں۔ اور یہ واہمہ ہو۔ مگر

دو تین دفعہ بلغم کو دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا اور واقعی اسے نمونیہ ہو گیا تھا۔
لکڑیوں کے در و دیوار لکڑیوں کی چھت کے نیچے۔ عمر خاں کمبل میں
لپٹا ہوا پڑا تھا۔ اُس کے ہم پیشہ مزدوروں کی غمخواری اور ہمدردی کا نتیجہ
تھا کہ اُسے موت کے خوفناک کھڈ سے اُٹھا کر زندگی کی حدود میں دوبارہ
داخل کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ چند دن کی تکلیف اُسے بہت مضمحل کر گئی تھی۔
بصارت بہت کمزور ہو گئی تھی جسم اس قدر لاغر کہ جیسے سالوں کا بیمار ہو۔
غرض تین ماہ اسی طرح بغیر محنت مزدوری کئے گزر گئے۔
اب اس میں وہ جوش و سرگرمی نہ تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے
لگا تھا اور اس احساس کے ساتھ اسکے کام کی رفتار بھی مدھم ہو چکی تھی۔
اب وہ اس قابل نہ تھا کہ پہلی سی رفتار سے مزدوری کر سکے۔ بیماری
سے پہلے کی بچائی ہوئی پونجی میں سے کافی روپیہ بیماری اور بے کاری
میں صرف ہو چکا تھا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ اور عمر خاں پچاس
ساٹھ روپیوں سے زائد نہ جمع کر سکتا تھا۔ نہ کر سکا۔
ایک دن عمر خاں آہستہ آہستہ گاڑی کھینچتا ہوا شہر کی ایک سڑک
پر سے گزر رہا تھا کہ راستے میں اچانک کاکو تور خاں اُسے ملا! ور معمولی
مزاج پرسی کے بعد اُس نے کہا۔
"عمر دیکھو تم نے دس گیارہ مہینے تک روپیہ ادا کر دینے کے لئے کہا تھا اب تو
ایک سال گزر چکا۔ مگر تم نے روپئے ادا نہیں کئے میں کب تک انتظار کروں۔
عمر خاں نے اُسے اپنی بیماری۔ بیکاری۔ کمزوری کا سارا حال

سنایا۔ اور اُس سے ایک سال کی مزید مہلت طلب کی۔ مگر تور خان نے یہ سارا حال سن کر بجائے ہمدردی ظاہر کرنے کے بے رخی برتتے ہوئے کہا۔

"عمر دیکھو اگر تین ماہ تک تم نے روپیہ ادا کر دیا تو خیر۔ ورنہ میں اس کے بعد اپنی لڑکی کی شادی دوسری جگہ کر دوں گا"

عمر خاں نے انتہائی نرمی اور منت وسماجت سے اور مہلت کے لئے کہا۔ مگر ضدی کاکو تور خاں یہ کہہ کر چلا گیا۔

"میں نے کہدیا۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے زیادہ ولور مل رہا ہے۔ اور تین ماہ کی مہلت اس لئے تمہیں دے رہا ہوں کہ پہلے تم سے وَلور کا معاملہ طے ہوا تھا۔ میری لڑکی کے سر کے بال سفید ہو جائیں گے پھر میں کیا کروں گا۔ تین ماہ کے بعد تم مجھے مجبور نہیں کر سکو گے۔ اور اب تم جانو تمہارا کام"

عمر خاں نے اپنی انتہائی کوشش صرف کرنی شروع کی تاکہ تین ماہ تک پانسو روپیہ کما سکے۔ دن لمحوں کی صورت گزرنے لگے اور تین ماہ کے بعد عمر خاں صرف ایک سو روپئے جمع کر سکا۔ وہ یہ روپے لیکر کاکو تور خاں کے پاس گیا۔ اور کاکو تور خاں نے تھوڑے سے روپئے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کتنے ہیں؟"

"ایک سو" عمر خاں نے جواب دیا۔

"کیوں ایک سو کیوں۔ میں نے تم سے صاف صاف آج سے تین ماہ پیشتر کہدیا تھا۔ اب میں زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا۔ میں اب مجبور ہوں مجھے

پانچ ہزار روپے مل رہے ہیں۔ تم سے دو ہزار زیادہ۔"

عمر خاں نے یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی ایک بار پھر منت کی اور اب ایک سال کی بجائے چھ ماہ کی مہلت مانگی مگر کاکو تور خاں اپنی ضد کا پکا تھا۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ.............

"اب میں ایک دن کی بھی مُہلت نہیں دے سکتا۔ ایک ہفتہ کے بعد تمھاری ساری رقم ادا کر دی جائے گی اور بس۔"

گاؤں کے ملک اللہ داد۔ عمر خاں کے دوست رحیم داد۔ اور بہت سے لوگوں نے کاکو تور خاں کو سمجھایا۔ مگر بے سود۔ عمر خاں یہ سوچتا ہوا کہ کاکو میرا روپیہ ادا کرنے سے پیشتر کہیں اور اپنی لڑکی کی شادی نہیں کرے گا۔ مایوسی کی حالت میں شہر کو لوٹا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ شاید کہیں سے چار سو روپئے قرض مل جائیں یا کل پرسوں تک کاکو تور خاں کا خیال ہی بدل جائے عمر خاں بے تکی منطق میں اُلجھا ہوا۔ شہر کے نزدیک پہنچ رہا تھا۔

وہ سر جُھکائے بوجھل پاؤں گھسیٹتا ہوا یہ سوچتا جا رہا تھا پانچ ہزار روپیہ ولور ۔ دوسرا آدمی ۔ زینت گل ۔ اور اس کی شادی۔ اور میں پھر وہی عمر خاں ۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ وہ غصے میں لرزنے لگتا۔ پھر سوچتا۔ پانچ ہزار روپیہ۔ دوسرا آدمی۔ آخر کون ہے یہ؟ مجھے معلوم تو کرنا چاہیے تھا۔ خیر کچھ بھی ہو۔ یہ سب کچھ میرے جیتے جی نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو گا۔ وہ سوچتا چلا جا رہا تھا۔

امید و بیم۔ سعی لاحاصل۔ کوششِ ناتمام کچھ بھی کہئے۔ مگر وہی ہوا۔ جو ہونا تھا۔ عمر خاں باوجود کوششوں کے ناکام رہا۔ اور ایک ہفتہ گزر گیا۔

موسم سرما کا آغاز تھا۔ اخروٹ۔ بادام۔ شہتوت کے پتے زرد ہو ہو کر جھڑ چکے تھے۔ دوسرے تیسرے دن خوفناک برفبار بادل فضاؤں میں منڈلاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں کچھ کچھ برف سے ڈھکی جا چکی تھیں۔

آج بوڑھا مزدور لکڑیوں کی گاڑی کھینچنے کی بجائے لکڑیاں چیر رہا تھا۔ مگر اُسے آج کلھاڑا بہت وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ آج سے چار سال پہلے جس کلھاڑے کو خریدتے وقت اُس نے شکایت کی تھی کہ یہ بہت ہلکا ہے۔ آج وہی منوں وزن کا محسوس ہو رہا تھا۔ آج وہ اسکی ہمت کے برداشت سے باہر تھا۔ کئی بار اُس نے اپنے گرد آلود بازوؤں کو دیکھا۔ آخر یہ کیا بات ہے وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھوئی کھوئی نگاہوں سے فضاؤں میں تیرنے والے بادلوں میں کچھ تلاش کرنے لگا پُرسکوت تھمی پتلیوں میں سے نگاہیں نکل کر خلا میں تیر رہی تھیں۔

"کیا حال ہے دوست"

عمر خاں سُنکر چونکا۔ اس کے سامنے رحیم داد کھڑا تھا۔ اور وہ مسکرا کر اپنے دوست کے بے رونق چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ عمر خاں اس

کس قدر خیالات میں مستغرق تھا کہ اُسے یہ معلوم ہی نہ ہوا۔ کہ رحیم داد کب
اور کس طرف سے آیا ہے۔ حالانکہ رحیم داد عمر خاں کے سامنے پھیلی ہوئی
لمبی سڑک پر بہت دور سے اُسے بیٹھا دیکھتے ہوئے آیا تھا۔

"تم اس وقت کہاں"

"عمر خاں نے سنبھلتے ہوئے کہا"

"میں شہر آیا تھا۔ سوچا کہ تم سے بھی ملتا چلوں اور ایک"

رحیم داد خاموش ہو گیا۔ عمر خاں نے اُسے یکلخت خاموش ہوتے
دیکھ کر پوچھا:

"کیا ایک۔ بولو۔ چپ کیوں ہو گئے"

رحیم داد نے اپنی نگاہیں اپنے دوست کے رحم طلب چہرے سے
ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ایک یہ بات بتانے کے لئے آیا تھا کہ کل کاکو تور خاں نے اپنی لڑکی
کی شادی پشین کے امیر شین گل سے کر دی ہے" اور اس شین گل کے
گھر میں تین بیویاں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اور چوتھی یہ ہو گئی۔

عمر خاں نے یہ سُن کر محسوس کیا۔ کہ اس کی سماعت معطل ہو کر رہ گئی
ہے۔ اس کی بینائی سلب ہو چکی ہے۔ اور اس کے جسم پر قطب شمالی کی
طرح برف گر پڑی ہے۔ وہ خاموش تھا۔ ساکن تھا۔ اس کی نگاہیں خالی
فضاؤں میں تیر رہی تھیں اور اس کی یہ حالت دیکھ کر رحیم داد دل میں افسوس

کر رہا تھا۔ کہ عمر خاں کو کس قدر غم ہوگا۔ رحیم داد کا جذبۂ رحم دلی اس کے چہرے پر چھلک پڑا تھا۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد عمر خاں نے رحیم داد کی طرف دیکھا اور اُسے متاسف دیکھ کر بولا۔

"تم کیوں افسوس کرتے ہو دوست"

رحیم داد نے آہ بھرتے ہوئے کہا"

"تمھاری تمناؤں اور مستقبل کے خوبصورت ایوانوں کو کھنڈرات میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے تو کیا ہر انسان کو افسوس ہونا چاہیئے غریب کیا کریں"

غریب بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ میں اگر غریب ہوتے ہوئے ایک مقصد میں ناکام رہا تو اس کی وجہ خود غرضی ہے۔ یا امیر شین گل خود غرض ہے عمر خاں یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"کیسا خود غرض ہا زندگی ایک سخت جدوجہد و مجادلہ ہے دوست اپنی ہستی کے قیام کے لیئے ایک درخت کتنے آس پاس کے پودوں کو چوس جاتا ہے۔ ایک جاندار کس قدر جانداروں کو ہضم کر جاتا ہے۔ محض قوت شامہ کی تسکین کے لئے۔ محض اپنی ہوس بجھانے کے لئے کس قدر پھول عین بہار کے عالم میں توڑ لئے جاتے ہیں۔ مسل ڈالے جاتے ہیں روند ڈالے جاتے ہیں۔ انسان ضرورت اور بلا ضرورت اپنی الوسع ہر عمدہ اور خوشنما چیز کو اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے فائدے اور آرام اپنی مسرت کے خیال پر کسی دوسرے کے خیال کو کبھی ہرگز

ترجیح نہیں دے سکتا۔ محبت کیا ہے۔ خود غرضی دوستی کیا ہے۔ خود غرضی عبادت کیا ہے۔ خود غرضی زندگی۔ خود غرضی اور انسان از سرتاپا خود غرض ہے۔ اور اس خود غرضی کی تکمیل بذریعہ سرمایہ ہوتی ہو تو ایک غریب کیا اور اس کی اوقات کیا۔ لیکن سرمایہ دار بھی تو غریبوں کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔

ایک غریب سوسائٹی کے لئے لعنت۔ حقیر و ذلیل ہستی۔ مہلک و با۔ لیکن اس سوسائٹی کا وجود کہاں رہے گا۔ جب غریب ہی غریب نہ رہیں گے تو امیر کسے نام دیا جائے گا؟ یہ سب کچھ امیر جانتے ہیں۔ خود غرض جانتے ہیں۔

اگر شین گل خود غرض نہ ہوتا۔ یعنی امیر نہ ہوتا تو اس کے دل میں ہرگز چوتھی بیوی حاصل کرنے کا خیال پیدا نہ ہوتا وہ تین شادیاں پہلے ہی نہ کرتا اگر وہ ملک کے بہت سے نوجوانوں کی کم مائگی کو مدنظر رکھتا تو سوچتا کہ ہزاروں کنوارے ہی مر جاتے ہیں اور کبھی ہمارے خود غرض امیروں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ کتنی بے گناہ عورتیں اس دنیا سے کنواری ہی بوڑھی ہو کر قبروں میں جا بستی ہیں۔ کیونکہ خود غرض والدین اتنے بھاری ولور مقرر کر دیتے ہیں کہ غریب ادا نہیں کر سکتے اور ساری عمر محنت و مشقت کے بعد بھی محروم گزر جاتے ہیں۔ بالفرض اگر کوئی غریب اپنا پیٹ کاٹ کر محنت و مشقت اور مزدوری کر کے ولور ادا کرنے کی کوشش بھی کرے تو سرمایہ دار خود غرض ولور بڑھا کر اسے محروم کر دیتے ہیں۔ اس کی پرواہ نہیں

خواہ گھر میں پہلے ہی دو تین بیویاں موجود ہوں۔ یہ سب کچھ خود غرضی ہے دوست۔"

عمر خاں یہ سب کچھ ایک تجربہ کار لکچرار کی طرح کہہ گیا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ جب عمر خاں چپ ہوا تو رحیم داد سوائے اس کے کہ عمر خاں کی تائید کرتا اور کیا کہہ سکتا تھا کیونکہ جو کچھ عمر خاں نے کہا یہ ایک حقیقت تھی۔

جاڑے کی تاریک ترین رات کی شام۔ جس کے سیاہ و دبیز پردے ہر طرف حد نگاہ بن رہے تھے۔ ستاروں کی مدھم روشنی بادلوں کی ماتمی چادروں میں روپوش تھی۔ تیز اور تند ہوا کے جھونکے برف میں ڈوبے ہوئے آتے اور سم آلود تیروں کی طرح سنسناتے ہوئے سینوں کے پار ہو جاتے۔ روح کو لرزا دینے والی یخ ہوا۔ درختوں کی بیخ کنی میں معروف تھی جیسے لاکھوں جہنمی روحیں طبقۂ زمین پر اُتر آئی ہوں۔ ہر طرف سیاہی پھیل رہی تھی۔ کلی شہرہ کی دھندلی فضاؤں نے عمر خاں کو کالے کمبل میں ملفوف دیکھا تاریکی کے ساتھ ساتھ وہ گاؤں کی حدود کے نزدیک ہوتا گیا۔ خوفناک سیاہی اس کا استقبال کر رہی تھی۔ پر آشوب رات کی ستم ظریفی۔ ژالوں کی چوٹیں۔ تند و تیز ہوائیں۔ اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔

آج وہ اپنے جسم میں پھر جوانی کی تڑپ محسوس کر رہا تھا۔ شباب کا ولولہ اس کے دل میں موجزن تھا۔ آج اس کی آنکھوں میں پھر جوانی کا نشہ تھا اور اس کے سینے میں گرم تنفس موجزن تھا۔ اس کے جسم میں آج چنگاریاں

بھری ہوئی تھیں۔

اس کے آنکھوں پر اندھے پن کی پٹی بندھ چکی تھی۔ اخلاق کا پیالہ اسکی ٹھوکر سے چور چور ہو چکا تھا۔ جو اس کی صحت پر اُسے خود یقین نہیں تھا۔ اس کے تمام قوائے جسمانی میں ایک زلزلہ برپا تھا۔ کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ آج مجروح شرافت اور سینہ افگار غربت کی بے انتہا جد و جہد پر بھی ناکام رہنے سے اس کے نظام عصبی میں بغاوت ہو چکی تھی۔

کاکو نور خاں کے گھر کے دروازے میں ایک شخص پوستین میں لپٹا لپٹایا داخل ہونے ہی کو تھا کہ ایک کالے کنڈل میں لپٹے ہوئے آدمی نے جھپٹ کر پشت کی طرف سے تیزی کے ساتھ گردن پکڑ لی۔ اور آن کی آن میں وہی کالے کمبل میں لپٹا ہوا آدمی اس کو زمین پر پچھاڑ کر ایک خوفناک چھرے سے ذبح کرتا ہوا نظر آیا۔

عین اس وقت شہرہ کلی کا ملک اللہ داد اپنے دو نوکروں کے ساتھ لالٹین لئے پاس کے مکان سے نکلا۔ روشنی کو دیکھ کر عمر خاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ملک نے اسے پہچانتے ہوئے اور اس کے ہاتھ میں چھرا دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے عمر"

عمر خاں نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے لالٹین کی روشنی میں کاکو نور خاں کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

"افسوس میرا شکار اب بھی بچ گیا میں نے شین گل کی بجائے کاکو نور خاں

کو قتل کر دیا۔"

وعدہ

(از حفیظ مالیگانوی،
ایڈیٹر چنگاری مالیگانوں

ڈھلی ہوئی شام کی کیف اور نور میں ڈوبی ہوئی مترنم ہوائیں جھرکوں کا سینہ چاک کر کے اس کے دل و دماغ میں چھریاں سی چلانے لگیں اور وہ تفکرات کے ہجوم میں غوطہ کھائی ہوئی ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح ابھر کر پھر ڈوب گئی معاً ہوا قہقہوں کے نرغے میں کسمسائی ہوئی اتنے زور سے تڑپی کہ فردوس منزل لرزتی معلوم ہوئی اور سامنے کی بڑی کھڑکی جو ایک موٹے دبیز پردے سے ڈھکی ہوئی تھی کھل کر مسکرانے لگی جیسے کوئی مدتوں سے رنج والم کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے یک بیک سکون وراحت کی گود میں سانسیں لے رہا ہو۔

شبینہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بہت اونچے پہاڑ کی چٹان سے ٹکرا کر اپنے بوجھل جسم کے ساتھ زمین پر آ رہی ہے اس نے سچ مچ اپنے مردہ ہونٹوں پر ایک دلکش حسین جاذب نظر مسکراہٹ تیرتی ہوئی محسوس کی وہی ادھ کھلی کلیوں والی مسکراہٹ جسے نعمان حوروں کا تبسم

بہاروں کی نزاکت، غنچوں کی لطافت سے بھی زیادہ شوخ ولطیف
کہا کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی وہ مسہری پر لیٹے لیٹے کسمسا اٹھی
اور تڑپ کر چوکھٹ پر آرہی، سامنے دریا اپنے پورے جاہ وجلال
کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ بڑی بڑی موجیں غراتی ہوئی، چیختی ہوئی ایک
دوسرے سے دست وگریباں تھیں اور ماحول کی رعایت سے
کچھ اس بری طرح رگیدتی ہوئی چل رہی تھیں کہ شبینہ ایک بوجھ سا محسوس
کرنے لگی۔ جیسے کوئی اس کے نرم نرم بازؤں کو کھینچ رہا ہے او فٹ بال
کی طرح آسمانی فضاؤں کی انتہائی بلندیوں پر اُچھال رہا ہے وہ چونک کر
اور ہڑبڑا کر اپنی تھکی ہوئی بوجھل آنکھیں خوش رنگ قوس قزح کی
رنگین لکیروں میں چھپاں کرنے لگی۔

موسم برشکال کی دیوی ابھی ابھی اپنے آنسو خشک کر چکی تھی ہلکے
پھلکے ابر پارے ایک دوسرے کے گلے میں آسمانی نغموں کا ہار پہنا
رہے تھے منظر کی شوخی سے شبینہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ایک
ہلکی سی کراہ اس کے لطیف ہونٹوں سے بلند ہوئی اور وہ تھکے تھکے قدموں
کے ساتھ فردوس باغ میں اُتر آئی۔

ہر طرف ایک دل کشی۔ رعنائی۔ رنگینی مسکرا رہی تھی ہوائیں نہایت
لطافت سے چہلیں کر رہی تھیں۔ حسین لالہ وگل بچھے جا رہے تھے کلیاں
داد وتحسین کے لئے لب کھول رہی تھیں، غرض رنگ وبو کا ایک طوفان
تھا ٹھاٹھیں مارتا ہوا جو فردوس باغ کا محاصرہ کئے ہوئے آج پھولوں کی

مست خوشبو مشک وعنبر کو قدم چومنے پر مجبور کر رہی تھی شبینہ دنگ رہ گئی اور اپنے ہوش وحواس کو نذر رنگ و بو ہوتے ہوئے دیکھ کر اپنے آپ میں نہ رہی بے خود ہو گئی اور وہیں سبز مخملی فرش پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ جان بہار بن گئی، اوپر حد نظر تک وہی ابر پارے ایک دوسرے پر نثار ہو رہے تھے مگر قوس و قزح کسی کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہی تھی۔ دھندلکے جبڑے پھیلائے ہوئے اس نورانی رس بھری فضا کو نگل رہے تھے۔ شبینہ بیتاب ہو گئی اور غیر ارادی طور پر اپنے حسین رخساروں پر موتی جیسے دو چمکدار قطرے لرزتے ہوئے محسوس کئے اور اسے دل میں ایسی تیز چبھن معلوم ہوئی جیسے کوئی اسکے دل کی نازک رگیں مروڑ رہا ہے۔ معاً بجلی کوہ آتش فشاں کی طرح چیخ اٹھی وہ ڈر گئی اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے نعمان نے اسے ڈرادیا ہے۔ اور پیچھے سے آکر اس کی آنکھیں موند لی ہیں شبینہ تلملا اٹھی اور نعمان شوخ نعمان جس کی رگوں میں شباب خون بنکر دوڑ رہا تھا۔ فلک شگاف قہقہہ لگا کر شبینہ کے نرم و نازک ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دے رہا تھا۔

شبینہ کیا تم سچ مچ ڈر گئیں۔ ارے میں نے تو یونہی پیار سے آنکھیں بند کر لی تھیں مجھے کیا معلوم تھا تم اتنی دل کی مہین ہو اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہوتا تو شاید میں ایسی حرکت نہ کرتا۔

چلو ہٹو بھی مجھے تمھاری یہ باتیں اب ایک آنکھ بھی نہیں بھاتیں

شبینہ نے اسی تصور کے عالم میں کہا۔

اُس روز بھی تم نے یونہی مجھے ڈروا دیا تھا۔ اور میں خوف سے رات بھر تارے گنتی رہی تھیں تو ہر گھڑی مذاق ہی کی سوجھتی ہے جب دیکھو ایک نہ ایک شرارت ابھرتی رہتی ہے میں انسان نہ ہوئی حیوان ہوئی۔ ایسی چھلیں بھی کس کام کی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو مفت کی رسوائی ——— اور نعمان اس کی بات کاٹتے ہوئے کہتا۔

اچھا بھئی معاف کردو۔ اب ہم سنجیدگی ہی سے تم سے ملا کریں گے لو غصہ تھوک دو اور کہو بندے کو کس لیے یاد فرمایا۔ میں نے تو نہیں بلایا۔ اس نے اسی ترشروئی کے ساتھ جواب دیا ———

اچھا جی تم نے نہیں بلایا تو کیا مجھکو الہام ہوا تھا جو میں سیدھا یہاں چلا آیا، نعمان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

مجھے کیا معلوم، نہ بتاؤ گی، کہہ تو رہی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم۔

اچھا تو لو میں چلا۔

اور جب نعمان جانے لگتا تو ایک شریر تبسم اس کے بھیگے ہوئے رس بھرے ہونٹوں کا رس چوسنے لگتا۔ نعمان ناراض ہو گئے میں نے یونہی غصے میں کہدیا تھا لوٹ آؤ نہ جاؤ ورنہ میں تم سے کبھی نہ بولونگی اور نعمان دوڑ کر اس کی باہوں میں باہیں ڈالکر مسکرا دیتا۔

شبینہ بجلی کی گرجدار آوازوں سے بے پرواہ اسی حسین سپنے میں ڈوبی رہی۔ پی کہاں۔ پی کہاں۔ کی مسلسل شور قلقل سے بھی زیادہ

مستی بھری آواز نے اسے پھر اسی دنیا میں پہنچا دیا اب اس کے سامنے وہ پاکیزہ منظر آگیا جب اس نے پہلے پہل قدیر نعمان کو سامنے کی دو منزلہ عمارت کی کھلی ہوئی ململجی کھڑکیوں میں زیر مطالعہ دیکھا تھا۔

وہ نہایت اطمینان سے نیم آستین کی قمیص پہنے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ سڈول جسم بھنوی چہرہ لمبے لمبے چمکدار بال اس وقت وہ بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا اور سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے وہ اور بھی حسین معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ناسی کو تکے جا رہے تھے کہ نعمان کی انگلیوں میں سگرٹ کا آخری ٹکڑا اس بری طرح تڑپا کہ اس نے گھبرا کر ہاتھ جھٹک دیا سگرٹ قلابازیاں کھاتا ہوا نالی میں جا گرا۔ اور وہ دم بخود جلی ہوئی انگلیوں کو دانتوں تلے دابنے لگا جیسے وہ تمام جلن چوسنا چاہتا ہے۔

شبینہ یہ منظر دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنس پڑی، نعمان بھونچکا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے والا ہی تھا کہ سامنے شبینہ کو مجسم کفر بنی ہوئی عالت میں دیکھا وہ اس وقت قوس و قزح سے بھی زیادہ لطیف رنگوں والی ساڑی اور بلاوز میں ملبوس تھی۔ بھرے بھرے بازو نیم عریاں سینہ، بلند پیشانی ستواں ناک، کتابی چہرہ، بھیگے بھیگے لب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا مگر رعب حسن نے ایسی شکست فاش دی کہ آنکھیں چاروں شانے چت زمین پر آرہیں۔ اس نے دل تھام کر کتاب ہاتھوں میں پکڑ لی شبینہ اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر پھر ہنسنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے

نگاہیں پھر لڑ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بیچارگی کروٹ بدل رہی تھی
شبینہ جھر جھرا کر رہ گئی اور پہروں رات کے چوبیس چکروں میں گھومتے
ہوئے اس منزل پر پہنچ گئے جہاں محبت کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا
حتیٰ کہ اپنا وجود بھی بوجھل معلوم ہوتا ہے وہ یونہی ایک دوسرے کی
طرف والہانہ انداز سے کھنچتے رہے پرستش کرتے رہے یہاں تک کہ وہ
ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔

نعمان ابھی ہفتہ عشرہ ہوا جبکہ الہ آباد سے تعلیم حاصل کرنے کے
لئے آیا ہوا تھا، بورڈنگ میں چونکہ ہر وقت ایک ہنگامہ کارزار گرم رہا
کرتا تھا اس لئے اس کا دل وہاں نہ لگتا تھا۔ مجبوراً شہر میں آ کر رہنے لگا
اور ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔

کالج سے فارغ ہو کر وہ اپنا تمام وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف
کرتا تھا اور پھر نووارد کی حیثیت سے کوئی اس کا شناسا بھی نہیں تھا کہ
کچھ دیر گپ شپ میں گزار کر تازہ دم ہو جائے اس لئے وہ مجبوراً کتابوں
کا ہو کر رہ گیا تھا ہاں البتہ سینما پارک وغیرہ کا بہت شوقین تھا اور اکثر
آیا جایا کرتا تھا۔ مگر یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب وہ نیا نیا اس مکان
میں داخل ہوا تھا آجکل چونکہ ششماہی امتحان کی تیاری ہو رہی تھی اسلئے
اس نے آنا جانا بند کر دیا تھا کیونکہ اسے امتحان اچھے نمبروں پر پاس
کرنا تھا۔ اور پھر وہ اتنا مالدار بھی نہیں تھا کہ اپنا تمام وقت لہو ولعب
میں صرف کر کے امتحان میں فیل ہو جائے اور کالج کی بھاری بھرکم فیس

دوبارہ بھر کر داخلہ لے لے چونکہ وہ غریب ماں باپ کا نور نظر تھا۔ جو الہ آباد میں ایک شریف خاندانی آدمی متصور ہوتے تھے۔ اس لئے اس نے اپنے والدین کا نام روشن کرنے کے لئے رات دن ایک کر دیا تھا۔

شبینہ نے سوچا وہ غریب ہے تو کیا ہوا مجھے تو اس سے محبت ہے اور محبت سرمایہ دار اور غریب میں تمیز نہیں کرتی اس لئے وہ بہت خوش تھی اس کے آنے سے پہلے واقعی اس کی زندگی میں ایک لامحدود خلا تھا جو آجتک کسی صورت پُر ہوتا نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مانا کہ وہ مشہور سرمایہ دار کی لڑکی تھی جو نئی تہذیب، نئے تمدن پر جان چھڑکتا تھا اور اپنا ہی جیسا دولتمند گھرانہ پسند کرتا تھا جہاں اس کی لڑکی کے لئے عیش وعشرت کی تمام آسانیاں موجود ہوں اسے غریبوں سے سخت نفرت تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی لڑکی کی شادی ایک ایسے آدمی سے کر دے جو غربت میں پروان چڑھا ہو۔ بلا سے اگر وہ بھرے بھرے بازوؤں والا، تنومند اور خوبصورت ہی کیوں نہ ہو اسے تو بس روپیہ والا گھر چاہیئے تھا روپیہ والا جہاں اس کی لڑکی کو کوئی تکلیف نہ ہو یوں تو شادی کے لئے اکثر پیغامات آئے مگر وہ شبینہ کے والد جیسے مالدار نہیں تھے اس لئے فوراً رد کر دئے گئے کچھ تو شبینہ کو پسند نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ غریب ہونے کی بنا پر کچھ دن ہوئے شہر کے ایک رئیس نے خم ٹھونک کر اپنا پیغام بھجوایا جس کی بیوی اسے چالیس برس کی عمر میں اکیلا چھوڑ کر عدم آباد کو سدھار گئی تھی وہ بہت مالدار تھا شہر میں کئی دوکانیں اور ملیں نہایت شاندار

طریقے پر چل رہی تھیں۔ شبینہ کے والد بھی اسے اچھی طرح پہچانتے تھے ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ تقریباً رضامند تھے مگر شبینہ کی ضدی طبیعت کو بھی جانتے تھے اس لئے ڈرتے ڈرتے تذکرہ کیا شبینہ نے سنتے ہی ناک بھوں چڑھا لیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ مجھے اس بوڑھے سے روپیہ کے لالچ میں بیاہ دینا چاہتے ہیں تو یاد رکھئے میں خودکشی کرلوں گی اور اس بوڑھے سے کبھی شادی کرنا گوارا نہ کروں گی شبینہ کے والد مصلحتاً خاموش رہ گئے اور کچھ اس لئے بھی کہ کہیں واقعی وہ خودکشی نہ کر بیٹھے۔ شبینہ ایسی ہی ضدی طبیعت کی مالک تھی، وہ ڈر گئے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

شبینہ روز بروز طوفان شباب کے ہچکولوں میں تنکے کی طرح بہی جارہی تھی۔ شرارت و شوخی تو اس کے عضو عضو سے ٹپک رہی تھی پھر وہ کیوں نہ نعمان جیسے خوبصورت نوجوان سے رشتۂ محبت استوار کرکے اس خلا کو پر کرلیتی۔ جو اس کے دل ہی دل میں ناسور کی طرح بڑھتا جارہا تھا۔ اب اسے تنہائی کے جانگسل لمحات محبت کی رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے نظر آرہے تھے جس دن نعمان نہ ملتا۔ وہ سیدھے اسکے مکان پر پہنچ جاتی۔

کیوں جی کیا ہو رہا ہے۔ وہ محبت بھرے لہجہ میں کہتی اوہو۔ شبینہ تم یہاں نعمان حیرت زدہ ہوکر جواب دیتا۔ کیوں تمھیں بہت تعجب ہو رہا ہے۔ وہ اسی طرح گلفشاں ہوتی۔ نہیں یہ بات نہیں۔ نعمان شرمندہ ہوجاتا۔

پھر ——— میں سوچ رہا ہوں کہ میری شبینہ ابھی ابھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو کر راحت کدہ جا چکی تھی یہاں پھر کیسے نمودار ہو گئی۔ وہ اس کے چہرے کی سنجیدگی دور کرنے کے لئے محبت بھرے لہجہ میں کہتا تاکہ وہ پھر اس شوخ رنگ پھول کی طرح کھل کھلا اُٹھے۔ جو نسیم صبح کی اٹکھیلیوں سے مسکرا اٹھتا ہے۔ دیکھو جی مجھے یہ مذاق پسند نہیں۔ تو بھئی کون کافر مذاق کر رہا ہے۔ پھر یہ جلی کٹی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ کیا میں اب یہاں نہ آیا کروں واللہ تم بھی عجیب ہو۔ ذرا سی بات میں بگڑ بیٹھتی ہو۔ تم میں نے جھوٹ تھوڑا ہی کہا ہے۔

یعنی میں ابھی یہاں آ کر گئی ہوں۔ جی ہاں جھوٹے، بتاؤں۔ ہاں وہ کیسے۔

دیکھو پھر ناراض نہ ہو جانا۔ نہیں ——— تم ابھی میرے حسین تصورات کی آغوش میں مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں اور خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں نعمان نے ہنستے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور شبینہ ہزار منہ بناتے ہوئے مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس وقت دن کا اُجالا شفق کی بوقلموں شعاعوں کی خوراک بن رہا تھا۔ باہر پائیں باغ میں ہوائیں نہایت مست خرامی سے پھولوں کے سرخ و سفید رخساروں کو چوم کر محبت کے کبھی نہ ختم ہونے والے راگ سنا رہی تھیں۔ شبینہ نعمان کی آغوش میں سر رکھے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر کہیں اور پرواز کر رہی تھی۔

شبینہ کیا سوچ رہی ہو خاموش کیوں ہو۔ نغماں نے اسے بھینچتے ہوئے کہا۔

میں سوچ رہی ہوں کاش ہم ہمیشہ یونہی ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کا بہترین نغمہ سنتے رہیں اور اس کے تار کبھی ٹوٹنے نہ پائیں کاش! لیکن شبینہ تم جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو۔ اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے۔

کیوں تمھیں مجھ پہ بھروسہ نہیں رہا۔ یہ بات نہیں تو ایسی بات کیوں درمیاں میں لاتے ہو۔ جس کے سوچنے ہی سے مجھے وحشت سی ہو جاتی ہے میں جانتا ہوں تم ایک غریب ہو لیکن میری محبت تو غریب نہیں۔ شبینہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

مگر تمھارے والد اس رشتہ کو کبھی منظور نہ کریں گے۔

میں جو کچھ کہہ رہی ہوں ——— ٹھیک ہے کئی رشتے میرے سامنے تمھارے والد صاحب نے میری طرح ٹھکرا دئے ہیں۔ میں کس طرح جسارت کر سکتا ہوں مجھے تو ان سے بہت ڈر معلوم ہو رہا ہے۔ اور پھر واقعی میں اپنے آپ کو تمھارے قابل نہیں پاتا ہوں کہاں تمھاری یہ عظیم الشان بلڈنگ اعلیٰ فرنیچر صوفے۔ مخملی گدّے۔ پائیں باغ۔ اور کہاں میرا ٹوٹا پھوٹا مکان نہ مخملین گدے نہ صوفے بھلا تم ہی بتاؤ میں کیسے تمھارے ناز اٹھا سکتا ہوں تمھیں تو کوئی ——— بس نعمان میرے دل کے ٹکڑے نہ اڑاؤ۔ کیا تم جانتے ہو میں ان پر تکلف چیزوں کے بغیر

زندہ نہیں رہ سکتی بخدا یہ چیزیں خود میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہیں میں تو خود چاہتی ہوں کہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاؤں جہاں یہ سب جھگڑے نہ ہوں صرف تم ہو اور میں —— سچ شبینہ، ہاں نعمان کیا تم میرے لئے اپنے آپ کو بھی قربان نہ کرسکو گے؟ کر تو ضرور سکتا ہوں پر مجبور ہوں کیوں کہ میری ایسے ماحول میں پرورش ہوئی ہے۔ جہاں پر والدین کا حکم مرگ مفاجات کی حیثیت رکھتا ہے اور میں ان کے بغیر حکم کے شادی تو کیا ال بھی نہیں سکتا۔ ابھی صبح ہی ان کی بیماری کا تار مجھے ملا ہے جس میں لکھا ہے فوراً آجاؤ میرے بچنے کی کوئی امید نہیں۔

اب تم ہی بتاؤ میں کتنا مجبور ہوں —— مگر نعمان اس کی زبان کسی پیش آنے والے خطرے سے کانپ اٹھی۔ تم نہ جاؤ جھوٹا تار دیکر رک جاؤ میں ابا جان کو شادی پر رضامند کرلوں گی میں تمھارے بغیر زندہ رہنا بیکار سمجھتی ہوں بولو نعمان چپ کیوں ہوگئے۔ کیا میں تمھارے لائق نہیں ہوں۔

افسوس شبینہ تم مجھے ایک ایسے فعل پر آمادہ کر رہی ہو جو تمھارے شایان شان نہیں پھر بھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ واپسی پر ضرور تمھارے خیالات سے متفق ہونے کی کوشش کروں گا —" اور ابھی کیوں نہیں؟ دیکھ رہی ہو سفری بیگ ٹھیک ہو چکا ہے میں شام کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں گا۔

شبینہ کو ایسا معلوم ہوا گویا الیکٹرک کے کھلے ہوئے تار کی برقی رو

اس کے جسم میں سرائیت کر گئی ہے۔ اور رگ رگ میں سنسناتی پھر رہی ہے قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتی نعمان نے اسے بازوؤں میں لے لیا شبینہ سنبھل گئی اور ہوش و حواس مجتمع کر کے کہنے لگی۔

نعمان تم کس قدر ظالم انسان ہو میں کب سے تمہاری منتیں کر رہی ہوں اور تم وہی پرانا راگ الاپ رہے ہو۔ تمہیں ذرا بھی مجھ پر رحم نہیں آتا آیا میری جان ہی لینے کا ارادہ ہے۔ شبینہ نے اس کے کوٹ کا کالر مضبوطی سے تھام کر سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

شبینہ آج یہ تم کو کیا ہو گیا ہے ذرا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ میں کتنا مجبور ہوں یہ صحیح ہے کہ میں بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ تم کو مجھ سے ہے۔ لیکن بعض اوقات محبت پر فرض بھی پیارا معلوم ہونے لگتا ہے اس لئے اس وقت مجھے معاف کر دو اور اپنے آنسوؤں کو روکو میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد تم سے ملنے آؤں گا اور پھر —— پھر نعمان اس تمام آرزؤں امیدوں کا گلا گھونٹ کر ریل پر سوار ہو گیا۔ شبینہ کچھ دیر تک بت بنی ہوئی اسے دیکھتی رہی جب کافی دیر ہو گئی تو وہ چشم پر نم کے ساتھ گھر لوٹ آئی۔ وہ سوچ رہی تھی سوچے جا رہی تھی اور تمام واقعات ایک ایک کر کے اس کے سامنے متحرک فلم کی طرح کھچے آ رہے تھے کہ اتنے میں بجلی کچھ اس زور سے تڑپی کہ سارا فردوس باغ لرز اٹھا شبینہ چیخ مار کر برآمدے کی پرلی طرف سے بھاگ کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ یک بیک وہی ابر پارے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں

ڈالے ہوئے آسمان کی فضائے بسیط پر چھا گئے۔ ہوائیں جھنگھاڑتی ہوئی سرسرانے لگیں اور شبینہ اس رات کو کھڑکی پر اس سے زیادہ دبیز پردہ ڈال کر مسہری پر سسکیاں لینے لگی۔ تبھی واپس نہ آیا وہ ایسا شکاری تھا جس نے طائرِ زیرِ دام کو تڑپنا ہی سکھایا تھا بس!

عفت

(از ہمشیرہ عارف۔ جہانگیر آباد جنسی بھوپال)

ہر روز ۵ بجے شام کو اس دوا کے دس قطرے اس نوزائیدہ کمزور بچی کی زندگی قائم رکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے رفیقہ سے کہا۔

معمول کے مطابق جب رفیقہ اس ناتواں بچی کے لئے جسے حقیقی معنوں میں انسان نہیں کہا جا سکتا۔ اور جس کی زندگی کا چمکدار ستارہ پوری طرح روشن ہوئے بغیر موت کی گھنگھور گھٹاؤں میں چھپ گیا تھا دوا تیار کر رہی تھی تو اسے یکایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے، صرف اس دوا کے چند قطرے زیادہ یا پاس ہی کی بوتل سے دوسری دوا اس ننھی سی جان کو ختم کر دینے کے لئے کافی ہیں قانون اس کو اپنی گرفت میں لے گا۔ عوام انگلیاں اُٹھائیں گے

رشتہ دار ملامت کریں گے لیکن وہ یہ کام کر کے رہے گی۔ وہ اس کو ختم کر کے دنیا کے جور و ستم سے آزاد کر دے گی۔ ایک لنگڑی لنجی بیمار لڑکی بڑے ہو کر خود محسوس کرے گی کہ وہ دوسروں کے لیے وبالِ جان ہے اور اس وقت اس کا قلبی انتشار خاموش مگر معصوم جذبات ایک ماں کے دل کو صد چاک کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اسے زہر دے دے تاکہ جوان ہو کر اسے مصائب و آلام کا شکار نہ ہونا پڑے۔ وہ ابھی اپنے ارادہ پر عمل نہ کرنے پائی تھی کہ آواز آئی "اماں تم کیا کر رہی ہو" رفیقہ نے جلدی سے دس قطرے اس معصوم بچی کو پلائے اور چلی گئی۔ یہ آواز رفیقہ کے بڑے لڑکے نعیم کی تھی۔ جس کی عمر چھ سال کی ہے۔ وہ صحت و تندرستی کا مکمل نمونہ خوبصورت اور شریر ساتھ ہی بدشوق اور خودسر۔

(۳)

اس بچی کی وجہ سے جس کا نام عفت تھا۔ رفیقہ و حلیم کے چھوٹے سے گھر پر ہمیشہ اُداسی چھائی رہتی تھی۔ رفیقہ گھر کے دوسرے کام کرنا چاہتی تھی۔ لیکن عفت کا خیال اس کے تمام ارادوں کو درہم برہم کر دیتا تھا عفت کا باپ حلیم ۵۰ روپیہ ماہوار کا پرسن کے مل میں ملازم تھا اور جگہ قسمت آزمائی کرنے جانا چاہتا لیکن وہ اس کو چھوڑ کر دور جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ دراصل حلیم و رفیقہ دونوں اس بچی سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ جس میں والدین کی محبت ہی شامل نہ تھی بلکہ انسانی

ہمدردی بھی۔ لیکن اور ہندوستانی والدین کی طرح اس کے لئے عفت کا خیال سوہان روح سے کم نہ تھا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کا شادی کی منڈی میں کوئی ارزاں ترین گاہک بھی پیدا نہ ہوگا۔ اس لئے رفیقہ کا شوہر اکثر ہسپتالوں میں جایا کرتا اور ڈاکٹروں سے اس بچی کا موثر علاج کرنے کی درخواست کرتا۔ لیکن تمام علاج معالجہ ناکامیاب ثابت ہوئے اگر وہ مالدار ہوتے تو ممکن تھا کہ دوسرے ممالک میں لے جاکر اُس کا علاج کراتے جس سے کم از کم وہ بستر پر ہی بیٹھ سکتی لیکن یہ خیال ہی تھا کیونکہ ان کے پاس اتنا روپیہ کہاں تھا کہ وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہناتے۔

(۳)

اسی طرح عفت دو سال کی ہوگئی لیکن اس کی نشو و نماہت کمزور تھی دماغی حالت بھی اور بچوں کی طرح نہ تھی۔ اس کی بے رونق آنکھیں زرد چہرہ کا بے معنی اُتار چڑھاؤ نحیف و لاغر جسم ہر ایک آنے جانے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لینا اور رحم کا جذبہ دوسرے کے دلوں میں پیدا ہو جاتا۔ غرضیکہ وہ رحمدل اور دردمند نظروں کی آماجگاہ تھی لیکن ایک ماں یہ اچھی طرح محسوس کرتی تھی کہ یہ رحم و محبت کی نظریں چند دنوں میں نفرت و حقارت سے تبدیل ہو جائیں گی۔ نعیم اور ثریا گو کہ عفت کے حقیقی بھائی بہن تھے لیکن اُن کی ابھی سے یہ حالت تھی کہ وہ اُس کے پاس کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے صرف دور سے جھانک کر چلے جاتے

تھے۔ وہ ان کے اس طرزِ عمل کو برا سمجھتی تھی۔ لیکن وہ بچے تھے اور کم عمر وہ ماں کے جذبات کو کیا جانیں۔ ان کو اسی میں لطف آتا تھا کہ جھانکیں اور بھاگ جائیں۔

(۷)

ایک دن رفیقہ اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھی بچے گھر ہی پر تھے جب وہ واپس آئی تو نعیم نہایت تیزی سے اس کے پاس دوڑا ہوا آیا اور اس سے پہلے کہ وہ تانگے سے اتر کر گھر میں داخل ہوں کہنے لگا "اماں عفت آپ کے جانے کے بعد رونے لگی ہم نے بہلانے کی کوشش کی لیکن وہ چپ ہی نہیں ہوئی"۔ پھر تم نے کیا کیا اس نے پریشانی سے پوچھا۔ "پھر میں سٹول پر کھڑا ہو کر زمین پر کود پڑا۔ وہ ہنس پڑی اور رونا بند کر دیا۔ وہ بولنا چاہتی تھی لیکن نعیم نے موقع ہی نہیں دیا اور کہنا شروع کیا "اماں وہ واقعی ہنس پڑی۔ آپ کہتی تھیں کہ وہ کبھی آج تک نہیں ہنسی۔ چلئے میں آپ کو دکھاؤں۔ وہ اب بھی ہنس رہی ہوگی وہ اس کی باتوں کی رو میں کچھ کہہ نہ سکی اور اس کے ساتھ ہولی واقعی عفت نعیم کو دیکھ کر مسکرا دی اپنی اس چھوٹی سی عمر میں پہلی مرتبہ نعیم بے حد مسرور تھا اور اس کے سامنے طرح طرح کی شرارتیں کر رہا تھا وہ برابر ہنس رہی تھی۔ رفیقہ محو حیرت تھی کہ کس طرح اس کے درد آشنا لب مسکرانے کے لئے کھلتے۔ نعیم اب عفت کا گرویدہ تھا اور فخریہ اپنے والدین سے کہا کرتا تھا کہ "میں ہی وہ ہوں جس نے عفت کو ہنسایا۔

(۵)

عفت بیمار تو ہمیشہ ہی رہا کرتی تھی لیکن جب اس کی بیماری زور پکڑتی تو گھر بھر میں وہ صرف نعیم کے ہاتھ سے دوا پیتی۔ اور نعیم بھی اس کی تیمارداری نہایت تندہی اور جانفشانی سے کیا کرتا تھا۔ اکثر اسکول سے لوٹتے وقت اُس کے لئے پھول اور کھلونے لایا کرتا تھا جن کو لے کر وہ اپنی تکالیف کو بھول جاتی اور جلد ہی اچھی ہو جاتی۔

(۶)

تین برس کی عمر میں اُس نے بولنا سیکھا اور پہلا لفظ جو اُس نے کہا وہ "نعیم" تھا۔ نعیم غرور کے ساتھ کہتا "میں اُس سے باتیں کروا سکتا ہوں" اور پھر نرمی سے پوچھتا "میرا نام کیا ہے"؟ "نعیم" وہ جواب دیتی اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور آنکھیں روشن ہو جاتیں عفت میں کچھ کچھ ترقی کے آثار ظاہر تھے لیکن ابھی پوری طرح اس کے اچھے ہونے کی امید نہ تھی۔ حلیم اور رفیقہ کو رنج ہوتا۔ جب وہ خیال کرتے کہ وہ بڑی ہو گی اس کو اپنے نقائص معلوم ہوں گے اور ان کو لوگوں کے ہمدردانہ جملے "غریب لڑکی۔ بدقسمت لڑکی۔ آہ بیچاری" زندہ در گور کر دیں گے۔

(۷)

ایک دن اُن کے ہاں دعوت تھی کافی رات ہو چکی تھی مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ کہ عفت کے رونے کی آواز آئی مہمانوں نے اس کے رونے پر کچھ دھیان نہ دیا۔ لیکن جب وہ اپنی پوری طاقت سے روئی اور زور سے

"نعیم" پکارا تو رفیقہ دوڑ کر گئی۔ نعیم کے کمرہ میں آگ لگ رہی تھی۔ اور وہ
اُس کی مدد کے لئے رو رہی تھی۔ نعیم و ثریا زندہ و سلامت بچا لیئے گئے
اور آگ بڑی جد و جہد کے بعد بجھا دی گئی۔ جس کی خود زندگی کوئی زندگی
نہ تھی۔ اس نے اپنے بھائی اور بہن کی عزیز جانوں کو بچا لیا تھا۔ حلیم و
رفیقہ اُس بیمار لڑکی کے احسان مند تھے۔ نعیم عفت کا بیحد ممنون تھا۔
اس کی اس انوکھی امداد نے نعیم کا دل موہ لیا تھا۔ اور اس کی برادرانہ
محبت میں جوش پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ اس کی مسرت کا پہلے سے
بھی زیادہ خواہاں تھا۔ ثریا کو بھی عفت سے انسیت ہو چلی تھی۔

(۸)

جس طرح نرم و نازک پودا غور و پرداخت سے جلدی بڑھتا ہے
اسی طرح عفت میں بھی تبدیلی ہو چلی تھی چہرہ کی زردی شادابی و شگفتگی
میں تبدیلی ہو گئی۔ اب اس کا نازک چہرہ خوبصورت جاندار آنکھیں
نہایت ہی حسین و دلفریب نظر آنے لگی تھیں۔ گلاب کی پتیوں کے مانند
ہونٹ محبت بھری نظریں اپنی طرف مبذول کراتے۔ اس کی یہ خاموش
نگاہیں رفیقہ کو پرانے خیالات یاد دلاتیں۔ اور وہ شرمندہ ہو کر رہ جاتی
اس کی آنکھیں رفیقہ پر وہ اثر کرتیں کہ مدت کی عبادت و ریاضت
اتنی موثر نہ ہوتی۔

(۹)

کالج میں دو سال پڑھنے کے بعد نعیم نے ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ کیا

تاکہ ڈاکٹر ہوکر عفت کا خود علاج کرے۔ کیونکہ اس کا پختہ خیال تھا کہ جس محبت و شفقت سے وہ علاج کرے گا اس سے یقینا عفت کو صحت کلی ہوجائے گی لیکن اس ارادہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ نعیم کے والد حلیم کو دو ایک دو کانوں پر نوکری کرنی پڑی۔ رفیقہ کو بھی کفایت شعاری اختیار کرنی پڑی۔ اور نعیم نے بھی رات کے وقت لڑکوں کو پڑھانا شروع کیا۔

(۱۰)

عفت بارہ سال کی تھی جب نعیم میڈیکل کالج میں داخل ہوا عفت کی صحت پھر بگڑ رہی تھی۔ ہفتوں بستر پر پڑے رہنے سے وہ اور بھی کمزور ہو گئی تھی۔ نعیم کو اس کی صحت کی فکر تھی۔ وہ اس سے کہا کرتا "عفت دیکھو جب تک میں ڈاکٹر نہ ہو جاؤں تم کو بیمار نہ ہونا چاہیے ہمت سے کام لو" وہ سادگی سے پوچھتی "تم کتنے سال میں ڈاکٹر ہو جاؤ گے"۔ "پانچ سال میں" نعیم جواب دیتا "لیکن وقت بہت جلدی گزرتا ہے" "اچھا" عفت کا مختصر جواب ہوتا۔

نعیم کالج کا ذہین لڑکا تھا۔ امتحان میں ہمیشہ اول آتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا۔ یا سخت محنت کرتا تھا یہ صرف عفت کی وجہ سے تھا جس کا خیال اس کو چین نہیں لینے دیتا تھا۔ کیونکہ وہ جلد از جلد ڈاکٹر ہو کر اپنی بیمار بہن کا علاج کرنا چاہتا تھا۔

———..———

(۱۱)

عفت کی صحت اس عرصہ میں اور خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر کہتا تھا اسکی زندگی ایک کچے دھاگے میں بندھی ہوئی ہے۔ جو کسی بھی وقت ٹوٹ جائے اب اس کو دنیا کی کوئی چیز پسند نہ تھی۔ رفیقہ اس کا دل بہلانے کو دلچسپ کتابیں و قصے سناتی۔ لیکن وہ کبھی ان پر اظہار خوشنودی نہ کرتی۔ بس دن بھر اس کو نعیم کا انتظار رہتا اور جب شام کو وہ اُسے دیکھ لیتی تو اُسے بے پایاں مسرت حاصل ہوتی اور شادمانی سے اس کا چہرہ منور ہو جاتا عفت کی حالت دن بدن تشویش ناک ہوتی گئی۔ ایک دن جب اسکی کشتی حیات امید و بیم کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اس نے رفیقہ سے کہا" نہ جانے لوگ کیوں خوف کھاتے ہیں۔ میرا خیال ہے موت نہایت میٹھی نیند اور ابدی راحت ہے جس سے بیدار ہونا کوئی پسند نہیں کرتا۔ اماں تم کیوں رنجیدہ ہو" رفیقہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور آنسو بے اختیار نکلنے کے لئے مچل رہے تھے۔ وہ آنسو کو جذب کر کے مسکرانا چاہتی تھی لیکن اس کی اوپری مسکراہٹ میں آنسو نکل پڑے اور باوجود کوشش کے پریشانی نہ چھپا سکی۔ نعیم اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس نے خود پر قابو پانے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے کہا" صرف دو سال باقی ہیں۔ میرے ڈاکٹر ہونے میں عفت اپنے وعدہ کو یاد رکھو اور اس بیماری کا خیال مت کرو" "بیماری کا خیال مت کرو" عفت نے جملہ دوہرایا۔ اور ساتھ آنکھوں سے

دو موٹے موٹے آبدار آنسو نکل پڑے۔ اس کی روح جسد خاکی سے پرواز کرنے والی تھی۔ "عفت" نغیم نے گھبرا کر پکارا۔ "نغیم" اُس نے آہستہ سے کہا۔ اُس کے بیمار ہونٹوں پر وہی پہلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے نغیم کو اس کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ نغیم ایک بچے کی طرح جس کا کھلونا کوئی چھین لے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ "وہ کیوں مری" اس کا جواب رفیقہ کی طاقت سے باہر تھا۔ حلیم اور ثریا ساکت کھڑے تھے۔

(۱۲)

دو سال بعد نغیم کو ڈاکٹری کی سند مل گئی۔ خوبصورت سیاہ بالوں والا لڑکا اب ڈاکٹر نغیم تھا۔ رفیقہ و حلیم کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور انھوں نے اس خوشی میں اپنے دوستوں کی دعوت کی۔ مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ لیکن نغیم کو اُن سے کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ عفت کے کمرہ میں بیٹھا اس کی یاد میں آنسو بہا رہا تھا۔ رفیقہ خاموشی سے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اُس کو آتا دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ گفتگو شروع کرے وہ نم آلود آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز سے بولا۔ "کل میرے ساتھ قبرستان چلئے۔ میں عزیز بہن کی قبر پر چند پھول چڑھاؤں گا۔ کیونکہ وہ پھولوں کی بے حد شائق تھی۔ اس طرح اس کی روح کو بھی مسرت ہو گی۔" دوسرے دن رفیقہ حلیم و نغیم قبرستان سے واپس آ رہے تھے نغیم برابر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "اگر میں دو سال پہلے ڈاکٹر ہو جاتا تو

عفت کو میں زیادہ عرصہ تک زندہ تو نہ رکھ سکتا لیکن اس کی زندگی
اس دنیا میں آسان ضرور کر دیتا۔ لیکن اب میں بچوں کے امراض کے
متعلق پڑھوں گا۔ اور اس میں ماہر ہو کر اپنی زندگی اپنی مرحومہ بہن
کی یاد میں معذور و بیمار بچوں کے لئے وقف کر دوں گا۔ اس طرح جو
اس دنیا میں آرام و سکون سے ناآشنا رہی اس کو دوسری دنیا میں
روحانی سکون پہچاؤں گا"

(۱۳)

پانچ سال کے مختصر عرصہ میں نعیم مشہور ڈاکٹر تھا۔ عوام اُسکی عزت
کرتے تھے۔ اس کے ہم پیشہ اس کی تعریف اور ننھے مریض اس کو پسند
کرتے تھے۔ لیکن یہ تمام کامیابی و نیک نامی صرف عفت کی وجہ سے
تھی۔ اس کی بہادر و خاموش روح نعیم کو مشہور کر رہی تھی جس نے اپنی
زندگی بیمار بچوں کے لئے وقف کر دی تھی۔ رفیقہ اور حلیم اب بھی عفت کے
احسان مند ہیں۔ بیمار بچی رخصت ہو چکی ہے۔ لیکن ایک سبق دے گئی ہے
کہ دنیا میں جو کوئی آیا ہے وہ زندگی کا کچھ مقصد لے کر آیا ہے۔ خواہ وہ
تندرست ہو یا بیمار۔ کمزور ہو یا طاقتور۔

—<>•<>✥<>•<>—

دوست کے نام

(از نجمی)

ملیح آباد

۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء

دوست

آج تمہارا طعن و تشنیع سے لبریز خط ملا۔ شکریہ۔ لیکن یقین ماننا کہ مجھے تمہارے الفاظ سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ تمھیں نہیں بلکہ تمام دوستوں کے تہدید آمیز خطوط مجھے مل چکے ہیں۔ پھر بھی مجھے اپنے کئے پر ندامت نہیں ہے اور میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری زندگی بدیوں اور گناہوں سے بھرپور ہے لیکن اس فریضہ ہی کو یاد کر کے سوچتا ہوں کہ شائد خدا مجھے عذاب حشر سے نجات دیدے۔ ہنسو مت دوست! میری زندگی کی سب سے بڑی نیکی اور سب سے اہم کارنامہ یہی ہے جس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرا دنیا میں آنا بے کار نہیں ہوا۔

تمہارے نزدیک محبت جرم ہے۔ گناہ ہے۔ اتنا بڑا کہ اس کا کفارہ مرنے کے بعد بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ تمہاری سوسائٹی اور سماج نے ہمارے ہی ہمدردوں کو ہمارے خلاف کھڑا کیا ہے تاکہ ہمارے قدم ڈگمگا جائیں لیکن میں اور میری نرگس نے یہ عہد کیا ہے کہ ہم سماج کی پابندیوں کی زندگی پر محبت کی موت کو ترجیح دیں گے۔

میرے دوست کیا تم کہہ سکتے ہو کہ محبت ایک فطری جذبہ ہے اور اگر یہ غیر فطری جذبہ نہیں ہے تو پھر اسے گناہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ فطرت کی کی ودیعت کی ہوئی چیز کبھی گناہ نہیں ہو سکتی۔ پھر اگر ہم ایک دوسرے کے ہو گئے تو کیا بُرا کیا۔ حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس لئے میرا خیال ہے تمہیں بھی یہ کہتے ہوئے تامل نہ ہوگا کہ "محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے"۔ پھر جس چیز کے لئے ہم مجبور ہوں اسے غیر فطری فعل یا گناہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

محبت کیا ہے انسانی زندگی کا ایک جزو لاینفک، ایک غیر فانی جذبۂ فطرت کی نعمتوں کا شاہکار جس کے بغیر دنیا کی تخلیق بے کار تھی ہاں یہ جذبۂ لطیف ہی وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کو مکمل بناتا ہے۔

دوست! ان باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بھی آج تم اس کے محرک سے طنزیہ الفاظ میں خطاب کر رہے ہو۔ تمہیں بتاؤ۔ اب اسکو دلشکنی سمجھوں یا دلداری۔

تم نے اور میرے دوسرے دوستوں نے عجیب عجیب بہتان میری ذات پر لگائے ہیں۔ جن کا جواب دینے سے میں قاصر ہوں لیکن اب جبکہ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی سرگزشت سنانے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ سنو اور سناؤ! شائد اندھے سماج کی آنکھیں کھل جائیں اور ایسے بہت سے مجبوروں کی جن میں سماج سے مقابلہ کرنے کی قوت نہیں۔ زندگی سنور جائے۔

تمھیں یاد ہوگا دوست کہ تمھارے تمام ساتھیوں میں شائد میں ہی ایسا تھا جسے صنف نازک سے انتہائی نفرت تھی۔ میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ صنف لطیف سے محبت کی امید رکھنا حماقت ہے کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ عورت کو جذبۂ وفا فطرت کی جانب سے ودیعت ہی نہیں ہوا۔ وہ محض مردوں کے جذبات سے کھیلتی ہے لیکن آہ ——— آج میں اپنے الفاظ پر اس قدر نادم ہوں ——— نہ پوچھو

ہاں تو ———

نرگس کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جبکہ اس کی عمر شاید چودہ سال کی تھی۔ موسم بہار کی ایک ناشگفتہ کلی کے مانند وہ بادِ حوادث کے جھونکوں سے قطعاً ناآشنا تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے دیکھ کر اسکے دل میں بھی کوئی جذبہ پیدا ہوا یا نہیں۔ تاہم میرے دل میں ایک عجیب سی بیقراری پیدا ہوگئی۔ میں سنا کرتا تھا۔ محبت وہ جذبہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا لیکن آج اس کو حقیقی صورت میں دیکھ کر میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی غرض یہ تھا وہ ابتدائی دورِ محبت جس میں نرگس کی قربت میرے لئے روحانی مسرت کا پیغام لاتی تھی۔ میرے اور اس کے مکانوں میں چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ اس لئے دن میں اکثر مرتبہ میں اُسے دیکھ لیا کرتا اس قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ اس انسیت نے محبت کا درجہ اختیار کر لیا۔

وقت گزرتا رہا۔ محبت مدارج طے کرتی رہی۔ لیکن اس دو تین ماہ

کے عرصے میں بھی ہم دونوں سوائے ایک دوسرے کی صورت تکنے کے کچھ نہ کر سکے ...... خاموشی اور کب تک ـــــــ آخر کار یہ حجاب بھی ٹوٹا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے سلسلہ کلام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ـــــــ آہ کس قدر مسرت آگین تھا وہ وقت جب میں نے پہلی مرتبہ اپنی نرگس کو اعتراف محبت کرتے سنا۔ دوست نہ پوچھو ـــــــ اس روز کی روداد ایک عجیب مستی اور سرور کے عالم میں میں اتراتا پھرتا تھا ایک اندرونی جذبہ تھا۔ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ ۔ کہ ہاں ـــــــ خوب ہنسو۔ گاؤ۔ قہقہہ لگاؤ۔ اس وقت تک ـــــــ جب تک کہ خود مضمحل ہو کر نہ گر پڑو ـــــــ اور اس کے بعد ـــــــ جس طرح ہر صبح شام ہوتی ہے۔ ہر کمال کو زوال ہوتا ہے۔ ہر عروج کو پستی ہوتی ہے اسی طرح ہماری محبت نے بھی فراق کی کروٹ بدلی اور ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ تفاصیل میں مت پڑو دوست کیونکہ اگر بات مفصل بیان کروں تو شاید یہ خط ناول کی صورت اختیار کر جائے۔ مجھے تو تم لوگوں کی تشفی مقصود ہے۔ ہاں ـــــــ

تو اب وہ عالم تھا جبکہ مجھے سارا وقت یہ شعر گنگنانے میں صرف ہوتا تھا۔

ہائے مجبوریاں محبت کی ‏ ‏ ‏ ‏ مر نہ جائے تو کیا کرے کوئی

شکوے، آہیں، فراقیہ اشعار اور اشکِ مسلسل یہ تھی میری کل کائنات جو اس زمانہ میں میں جمع کر سکا۔ جدائی کا ہر روز میرے لئے

سوہان روح تھا۔ وہ تو کہو بیچارے فاروق کی تسلی آمیز باتیں مجھے بہلائے رکھتی تھیں۔ ورنہ خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔ لے دے کے اس جگہ وہی ایک میرا رازدار و غمخوار تھا۔ اور جس کا یہ احسان تاعمر فراموش نہیں کر سکتا۔ —— بہرحال —— زمانہ گزرتا جاتا ہے وقت اپنی سواری تبدیل کرتا ہے۔ نئے سال کی آمد آمد ہوتی ہے اور میں ایک مرتبہ پھر اسی جگہ اپنی نرگس کو دیکھتا ہوں —— لیکن کس حالت میں —— آہ

آج وہ نرگس میری نہیں بلکہ کسی دوسرے کی ہوتی ہے۔ سماج اور سرپرست اسے دوسرے کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ اسکا انکار بجبر دبا دیا جاتا ہے۔ دنیا اسے بے حیا اور آوارہ کا خطاب دے دیتی ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس نے اپنی مرضی سے شریک زندگی کا انتخاب کرنا چاہا۔

واقعات گزر جاتے ہیں ایک دھندلی سی یاد رہ جاتی ہے لیکن قدرت ایک مرتبہ پھر انگڑائی لیتی ہے واقعات کو زمانے کی رفتار کے ساتھ بھلگنے سے روگ دیتی ہے۔ ایک دوسرے کا تقابل ہوتا ہے خوابیدہ جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس پر میرا حق نہیں میں اسے لکھتا ہوں۔

نرگس ——

اس جرأت کی معافی چاہتا ہوں۔ جو میں نے تمھیں خط لکھ کر کی ہے

زمانے نے ہم دونوں کو جدا کر دیا ہے۔ محبت جبر کا شکار ہو رہی ہے
لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی نہ بھولیں
محبت کا شعلہ بادِ حوادث کے جھونکوں سے گل نہیں کیا جا سکتا۔
میری محبت تمھاری شادی ہو جانے کے باوجود ہنوز اسی طرح ہے
امید ہے تم بھی اس سلسلہ کو نبھانے کی کوشش کرو گی۔
تمھارا ــ نجمی

ایک گھنٹے بعد جواب ملتا ہے۔

نجمی صاحب
مجھے حیرت ہے کہ آپ نے مجھے خط لکھنے کی کس طرح جرأت کی گزشتہ ایام
میں بھولی نہیں۔ آپ کی ہستی کا احترام مجھے اب بھی ہے لیکن آپ نے
مجھے شادی شدہ سمجھتے ہوئے بھی خط لکھنے میں جس جسارت کا ثبوت
دیا ہے اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی .... رہی محبت...
تو یہ لفظ میرے لئے بہت فرسودہ ہو چکا ہے۔ میری محبت کا آغاز اور
انجام میرا شوہر ہے ...... آپکا نام تو اب ـــــ میرے لئے
ایک واہمہ سے زیادہ نہیں جس کو سن کر سوائے چند اشک
...... بہا لینے کے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ امید ہے آئندہ آپ اس قسم کے
خطوط سے مجھے نوازنے کی کوشش نہ کریں گے۔

فقط ـــــ نرگس

آہ ـــــ میں نہیں کہہ سکتا اس کے بعد میری کیا حالت ہوئی۔

رات بھر مختلف خیالات میں غلطاں رہا لیکن کسی طرح تسلی نہ ہوئی تو صبح میں نے دوسرا خط لکھا۔

نرگس

تمہاری مرضی کے خلاف خط ضرور لکھ رہا ہوں لیکن یقین ماننا کہ میں بالکل مجبور ہوں تمہارے درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے الفاظ نے میرے دل میں ہل چل مچا رکھی ہے۔ فطرت کی دی ہوئی نعمت کو اگر دنیا یا سماج کے قوانین چھیننا چاہیں تو ہمیں اسکی حفاظت کرنی چاہیئے کیا تمہارے قدم اس مقابلے میں ڈگمگا جائیں گے۔

تمہارے جواب کا منتظر

نجمی

اچھا دوست! خط کی طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس داستان کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔ امید ہے تم بعافیت ہو گے۔ اگر فرصت ہو اور ایک سماج کے ٹھکرائے ہوئے شخص کے یہاں آنا ننگ نہ سمجھو تو آنے کی کوشش کرنا۔ نرگس تمھیں اور تمھاری شریک حیات کے لئے بہت بے چین ہے۔

اچھا بھئی میں اب جا رہا ہوں کیوں کہ نرگس کو میری عدم موجودگی شاق گزر رہی ہو گی۔

تمہارا ــــــ نجمی

(۲)

ملیح آباد

۲۸ر فروری ۴۷ء

بھیا احمد

یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ شکر ہے میری تحریر سے تمہاری غلط فہمیوں کا ازالہ تو ہوا۔ تم نے مجھے قابل فخر ہستی تسلیم کیا ہے لیکن ذرا سماج کے عفریت سے سنبھلے رہنا۔ کہیں میری ہمدردی میں تم بھی اس کے شکار نہ ہو جاؤ تم نے میرے قصے سے دلچسپی ظاہر کی ہے میری تحریر کو سوز و گداز کا مرقع سمجھا ہے۔ مگر دوست یہ سب۔

محبت کی ظالم فسوں کاریاں ہیں

میں خود میری تحریر، میری داستان سب کچھ اسی کی رہین منت ہے خیر

اب لو باقی داستان بھی سنتے چلو ____________

خط کو بھیجے ہوئے چار روز گزر چکے تھے۔ لیکن اب تک کوئی جواب نہ آیا تھا۔ طبیعت کا انتشار بڑھتا جاتا تھا۔

سچ مانتا بعض وقت تو ایسا دل چاہتا تھا کہ کہیں ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں دنیا کا کوئی متنفس نہ پہونچ سکے۔ لیکن انسان کا ارادہ ہی کیا۔ بہر صورت خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں بھی تمام ہوئیں۔ اور پانچویں روز مجھے ایک پرچہ ملا لکھا تھا۔

نجمی صاحب۔

باوجود منع کرنے کے آپ نہ ملنے۔ آخر وہی ہوا۔ جس بات کا ڈر تھا۔ انھوں نے کسی طرح آپ کا پرچہ دیکھ لیا۔ اب وہ بدگمان ہو کر مجھے طلاق دینے پر مصر ہیں۔ مجھے اپنا تو کوئی غم نہیں کیونکہ میری تخلیق کا مقصد ہی غم و آلام کا سہنا ہے۔ البتہ آپ کے مستقبل سے لرز رہی ہوں۔ خدا کرے آپ ہمیشہ مسرت وچین کے گہواروں میں رہیں۔

گنہگار ——— نرگس

عزیز دوست! نہیں کہہ سکتا کہ اسکا یہ خط دیکھ کر مجھے کسقدر افسوس ہوا اُف میری ذراسی لغزش نے اس کے روشن مستقبل کو خاک میں ملادیا اس روز سارا وقت مجھے دوڑتے ہوئے گزرا۔ میرا ضمیر بار بار مجھے ملامت کرتا۔ کیونکہ اسکی اس مصیبت کا بانی مبانی میں ہی تھا۔ آخر میں نے عہد کیا کہ خواہ زمانہ میرے خلاف ہو جائے لیکن میں اس عالم میں اس کی ضرور مدد کروں گا۔ غرض ارادہ میں استحکام پیدا ہوا۔ طبیعت کے انتشار کا خاتمہ ہوتے ہی میں ایک نئی دنیا میں کھو گیا۔

وقت حسب سابق گزر گیا۔ لیکن دوسرے روز مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ وہی مکان جو میرا کاشانۂ حیات تھا۔ اس وقت حزن وملال کی صورت بنائے کھڑا تھا۔ نہیں معلوم کیوں میرا دل امڈا۔ اور میں بستر پر آکر گر پڑا۔ خدا جانے کتنی دیر تک روتا رہا۔ جب آنکھ اُٹھائی تو معلوم ہوا فاروق میرا دوست کھڑا پکار رہا ہے۔ اس بیچارے نے میری روداد غم سُنی دیر تک مجھے سمجھاتا رہا۔ یہاں تک کہ خود اپنی داستان سنائی۔

استقلال طبیعت دکھایا۔ کچھ تسکین ہوئی اور وہ رخصت ہو کر چلا گیا۔

اس عرصۂ جدائی کے تقریباً تین ہفتہ بعد مجھے ایک خط ملا۔ جو نرگس کا تھا۔ لکھا تھا۔

نجمی صاحب

مجھے ننگ اور آوارہ کے خطاب کے ساتھ طلاق کی سند مل چکی ہے ہر شخص میرے قریب آنے سے گھبراتا ہے۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں میرے سائے سے بھی کتراتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب جینے کی حسرت بھی نہیں رہی۔ لے دے کے آپ کا خیال ہے جس کے سہارے زندگی کے یہ لمحات گزار رہی ہوں۔ کیا میں امید کروں کہ آپ اپنے الفاظ پر قائم رہیں گے۔

نرگس

یہ تھا نرگس کا خط جس نے میرے مردہ تن میں ایک بار پھر روح پھونکدی۔ اور زندگی کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ میں نے اسے کہا۔

نرگس

تمہاری یاد آوری کا شکریہ۔ یقین ماننا کہ میرے دل میں تمہاری محبت اب بھی اسی طرح جاگزیں ہے۔ تم یہ بھول کر بھی مت خیال کرنا کہ میری محبت محبت نہیں۔ بلکہ بوالہوسی تھی۔ میرے لئے تم اب بھی ویسی ہی معصوم اور پیاری نرگس ہو۔ جیسی شادی سے قبل تھیں عنقریب میں تمہارے والد کو شادی کا پیام دینے والا ہوں —— آہ —— کیسی

پر مسرت ہوں گی وہ گھڑیاں بھی جب ہم حقیقتاً ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔

تمھارا نجمیؔ

میرے عزیز دوست! خط کو ختم کرتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔ یہ دیکھو نرگس کرسی کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔ ہر مرتبہ لکھنے میں چھیڑ دیتی ہے ...... اچھا...... آئندہ میں اپنے اور اس کے خطوط پیش کرونگا جس سے تمھیں باقی حالات سے واقفیت ہو جائے گی۔

تمھارا ــــــ نجمیؔ

(۳)

ملیح آباد

۷۔ مارچ ۱۹۴۰ء

ــــــــــــــــ احمد

خط ملا۔ تمھارے آنے کی خبر سنکر انتہائی مسرت ہوئی۔ شکر ہے۔ تم نے مجھے اس قابل تو سمجھا۔ لو اس خوشی میں اپنی داستان بھی مکمل کئے دیتا ہوں۔ یہ ہیں ہمارے وہ خطوط جو رشتۂ ازدواج سے قبل تحریر کئے گئے۔

(۱)

نجمیؔ صاحب

خط ملا! سچ کہتی ہوں۔ آپ کے شادی کے ارادہ پر عرصہ تک ہنستی رہی اس وقت کی قلبی کیفیت تحریر میں لانے سے قاصر ہوں۔ آپ مجھ سے شادی کریں گے۔ لیکن سماج کے خونخوار درندے اس کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوسکتے۔ یہ بھی چھوڑئے آپ کے والدین ہی اس کو کب گوارا کریں گے۔ کہ ان کے لڑکے کی شادی ایک تنگ اور غریب خاندان

میں ہو ــــــــ بہتر ہے مجھے بھول جایئے۔ کسی اچھی جگہ شادی کرکے اپنے والدین کی خوشنودی حاصل کیجیئے۔ ایسا نہ ہو کہ دنیا آپ کو بھی وہی کہنے لگے جو آج مجھے کہتی ہے۔

آپکی ــ نرگس

(۲)

میری اچھی نرگس

تمھارے الفاظ سے انتہائی صدمہ پہنچا۔ تم نے میری محبت کو محض دھوکا۔ فریب یا سایہ سمجھ رکھا ہے۔ خیر آئندہ آنے والے واقعات بتائیں گے کہ میری محبت کو سماج کا عفریت یا اس کے لواحقین فنا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ بقیہ ــــــــ مجھے امید ہے کہ تم مجھے بھولوگی نہیں۔

تمھارا ــ نجمی

(۳)

سرتاج ــ

یہ تم نے کیا کیا .... مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے میری وجہ سے والدین کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ اس شادی کے خلاف تھے میں پھر کہتی ہوں مجھے بھول جاؤ۔ تمھارے لئے بزرگوں کی رضا جوئی ہی اصل چیز ہے ...... ارے تم خفا ہو گئے۔ میری اتنی سی بات سے ــــــــ ہائے کیسے کہوں کہ میری نظروں میں ہر دم تمھاری ہی صورت جاگزیں رہتی ہے اور شاید مرتے دم تک یہ نعمت مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا ــــــــ میرے میں سب کچھ تمھارے ہی بھلے کے لئے کہتی ہوں۔ میرا کیا ہے میں نے

اپنا دل، جان، عزت سبھی کچھ تم پر قربان کر دی ہے۔ ــــــ آہ ــــــ مجھ بدنصیب پر اس قدر غصہ نہ کیا کرو ــــــ اچھا لو اب میں کچھ نہ بولوں گی۔ جو تمہاری مرضی ہو۔

تمہاری۔ نرگس

دوست! طرز تخاطب کے پیرائے بدل چکے تھے۔ بیگانگی کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ اور میری دلی مسرتوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا ــــــ میں نے اسے لکھا۔

پیاری نرگس۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے محبت کو فتح بخشی۔ اور دنیاوی طاقتیں مجھے منہ چڑاتی رہ گئیں۔ سنو! تمہارے والد نے میرا پیام قبول کر لیا ہے اب جلد ہی ہم دائمی طور پر ایک دوسرے کے ہو جائیں گے ... کیسی پرکیف ہوگی وہ زندگی بھی ...... جب میری نرگس کو دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے چھین نہ سکے گی۔ اچھا باقی آئندہ۔

تمہارا ...... بخمی

بھیا احمد! یہ تھا میرا آخری خط۔ جس کا جواب آج تک نہ ملا۔ کیونکہ ایک ہفتہ بعد ہی وہ ہستی جس کے لئے سب کچھ ہوا تھا میری ہو گئی بقیہ حالات تو تمہیں معلوم ہی ہیں۔ کس طرح مجھے گھر چھوڑنا پڑا۔ دوستوں اور عزیزوں کی کتنی ملامتیں سہنی پڑیں۔ خود اپنے ہی خط پر غور کر لو۔
بہرحال فطرت کے دئے ہوئے استقلال میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اور

محبت کا پودا پروان چڑھ کر بار آور ہو گیا ——— اچھا اب رخصت ہوتا ہوں دوست۔

جلد نرگس سے ملو اور فطرت انسانی کی بلندیوں کا مطالعہ کرو۔ حقیقت اور افسانہ کا فرق دیکھو۔ تمہارا ..... نجمی

سرمایۂ عبرت

از چودھری ممتاز حسین بسملؔ
گھرتل ضلع سیالکوٹ پنجاب

خود عمل پیرا ہے صورت گر تری تصویر کا ۔ شکوہ کرنا ہے تو اپنا کر مقدر کا نہ کر

رات تاریک اور ڈراؤنی تھی۔ غوث پور کا پرانا اور ویران گاؤں اندھیرے میں تپ دق کے نیم جاں مریض کی طرح زندگی اور حس و حرکت سے ناآشنا دکھائی دیتا تھا۔ محنتی اور غم نصیب کسان کب کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ چوپال کے قریب ایک ٹوٹے سے مکان میں مٹی کا ایک چھوٹا سا ..... دیا روشن تھا۔ لو تھرا رہی تھی۔ روشنی کانپ رہی تھی۔ اور ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک بیمار بوڑھا زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ کمرے میں چند ایک گرد آلود مٹی کے برتن، دو چار پھٹے پرانے کپڑے اور ایک شکستہ ہل۔ اچانک مریض نے

کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر پھٹے پھٹے دیدوں سے اردگرد دیکھا ایک نوجوان جسے پریشانیوں ناکامیوں اور بھوک نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا آگے بڑھا۔ بوڑھے کو سہارا دے کر اُٹھایا اور پانی پلایا۔

"حیات روٹی کھا چکے" بوڑھے نے پوچھا۔

"نہیں . . . ابا . . . . . دانے" حیات کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے آواز گلے میں پھنس گئی۔

بوڑھا بے چین ہو گیا۔ اُس نے کہنیوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک ظاہر ہوئی۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اور شدت جذبات سے آواز کانپ رہی تھی۔

"بیٹا تمہارا دادا آدھے گاؤں کا مالک تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں اپنے خاندان کو عروج پر دیکھا ہے۔ وہ مقام جہاں اب نمبرداری کی حویلی ہے۔ ہمارا آبائی مکان تھا۔ ہماری کوٹھریاں غلہ سے بھری رہتی تھیں۔ گھر میں کام کاج کے لئے کئی نوکر تھے۔ سواری کے لیے عمدہ گھوڑیاں تھیں۔ گھر میں کافی گائے بھینسیں تھیں۔ دودھ اور گھی کی اتنی بہتات تھی بیٹا کہ اچھی طرح کھا پی لینے کے بعد بھی بچ جاتا تھا"

"بوڑھا کہہ رہا تھا اور حیات حیرت سے مُنھ کھولے یہ داستان سن رہا تھا آخر اُس سے نہ رہا گیا اور بولا "اب تو ہمیں سر چھپانے کے لئے بھی جگہ نہیں ملتی۔ نہ تن پر کپڑا ہے اور نہ پیٹ کو روٹی"

"تم ٹھیک کہتے ہو بس مجھے ذرا پانی پلاؤ" بوڑھے نے کہا۔

حیات نے پانی پلایا۔ اور بوڑھا انسان اپنے میلے کچیلے بستر پر لیٹ گیا بھیا میرے دیکھتے دیکھتے ہماری خوشحالی کا محل بھیانک کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔ جانتے ہو ہماری تباہی کا باعث کیا ہے؟"

"قرض" حیات نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" بوڑھے نے کہا "مگر اس کے لئے کون ذمہ دار ہے"

"ذمہ دار" حیات نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ذمہ دار"؟ بوڑھے نے جواب دیا "یہ مصیبت کسی اور کی لائی ہوئی نہیں ہے۔ ہم نے غلطی کی اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

"کونسی غلطی" حیات نے دریافت کیا۔

"اللہ بخشے تمھارے دادا جان نے تین شادیاں کی تھیں" بوڑھے نے کہا "پہلی دو بیویوں سے کوئی اولاد نہ تھی تیسری شادی کے دو سال بعد میں پیدا ہوا تمھارے دادا کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ بزرگوں کا کافی اندوختہ تھا۔ وفور مسرت سے تمھارے دادا نے تن کے کپڑے بھی مانگنے والوں کو دیدئے۔ ایک ہفتہ برابر ضیافت ہوتی رہی۔ دور دور سے ڈوم اور میراسی آئے اور جھولیاں بھر بھر کر لے گئے۔ گاؤں کے خدمتگاروں کو انعام میں سونے کے زیورات ملے۔ اناج اور کپڑوں کے علاوہ مویشی بھی مبارکباد دینے والوں کی خدمت میں نذر کئے گئے۔ جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کھیتی باڑی کیلئے

بیلوں اور گھر میں کھلانے کے لئے اناج کی ضرورت ہوئی۔ مجبور ہو کر قرض لیا۔ تمھارے دادا نے قرض لینے میں بہت فراخدلی دکھائی مگر بعد میں اُسے بالکل بھلا دیا۔ اور حسب معمول اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔

بوڑھے نے پر اشتیاق نظروں سے پانی کے گڑھے کی طرف دیکھا۔ حیات اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اور پیالے میں پانی بھر لایا۔

"مجھے ذرا سہارا دو"۔ بوڑھے نے کہا "میں موت کے فرشتہ کو اپنے اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اور مرنے سے پہلے یہ کہانی ختم کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں تین سال کا ہوا تو میری بسم اللہ کا وقت آیا مدتوں کا اندوختہ تو پہلے ہی خرچ ہو چکا تھا۔ قرض کا بوجھ پیشتر سے موجود تھا مگر قبلہ والد صاحب کسی سے کم نہیں رہنا چاہتے تھے عظیم الشان پروگرام مرتب کیا اور ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس موقع پر دل کھول کر خرچ کرو تاکہ صدیوں تمھارے نام کی گونج باقی رہے اور دیکھنے والے واہ واہ کرتے رہ جائیں۔ انھوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے دوبارہ قرض لیا اور ایک ہفتہ تک برابر دیگیں پکتی رہیں۔ علاقہ کے تمام شہدے اور اوباش جمع ہوئے اور خوب پلاؤ قورمے اڑائے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں روپے کا کپڑا گھر میں خرچ ہوا۔ انعام و اکرام میں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ اور دور دور تک اس جشن شاہانہ کی دھوم مچ گئی۔ قبلہ والد صاحب خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے مگر انجام کار یہ محفلِ نشاط زہر ہلاہل ثابت ہوئی۔ قرض کا روپیہ سیل رواں

کی طرح بڑھتا چلا گیا۔ مگر تمہارے دادا جان کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی آخر کار یہ غفلت رنگ لائی اور ہماری فضول خرچی ہلاکت اور بربادی کی گھنگھور گھٹا بن کر ہمارے مطلع حیات پر چھا گئی۔

"میں دس برس کا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں اپنے مکان کی چھت پر دھوپ میں بیٹھا گنے چوس رہا تھا۔ خلاف معمول اُس روز ہمارے گھر میں حیرت انگیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ قبلہ والد صاحب کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور والدہ کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں مگر میں آنے والے حوادث سے بے خبر اپنے معصوم شغل میں مصروف تھا۔ دوپہر کے قریب پولیس کی ایک جمعیت ہمارے مکان پر پہنچی اور ہمیں زبردستی ہمارے آبائی مکان سے نکال دیا گیا۔ اس وقت میری ماں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ والد صاحب سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ اور گاہ بگاہ اُن کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل جاتی تھی۔ میں بچہ تھا۔ سرخ پگڑی والوں کو دیکھ کر ڈر گیا اور ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ والد صاحب نے مجھے چپ کرانے کی کوشش کی مگر خود اُن کے دل کے زخموں سے لہو بہہ رہا تھا۔ اس لئے انکی مصنوعی جرأت میری ہمت بڑھانے سے قاصر رہی۔ اسی روز ہماری زمین چھن گئی۔ ہمارے مویشی نیلام کر دئیے گئے۔ ہماری جائداد بیچ دی گئی اور ہم خانماں برباد ہو کر چوپال کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے آ بیٹھے۔

اچانک بوڑھا کسان غش کھا کر گرا مگر حیات نے اُسے اپنے

بازوؤں میں سنبھال لیا۔ بوڑھے کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ وہ ایک ویران محفل کی شمع کشتہ کا دھواں تھا۔ اور اس کی آنکھ شوکتِ گم گشتہ کا نظارہ دیکھ رہی تھی حیات نے اپنے بیمار اور بوڑھے باپ کے مُنہ پر پانی چھڑکا دامن سے ہوا دی اور جفاکش انسان جلد ہوش میں آ گیا۔ اور کافی دیر بعد اس نے پھر وہی قصہ شروع کر دیا "قبلہ والد صاحب اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے" بوڑھے نے کہا "ہمارے بعض بھائی بندوں نے اُس کی ہمّت بندھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ایک رات وہ چپکے سے باہر نکل گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ میری والدہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکی۔ میری دو بہنیں تھیں۔ وہ بھی ایک سال کے اندر اندر اپنی ماں سے جا ملیں اور میں اس خارزار عالم میں تنہا رہ گیا۔ سیلاب میں گھرے ہوئے تنکے کی طرح مدتوں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ حوادث نے مجھے بہت تجربہ کار بنا دیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد میں نے اپنی آبائی زمین کا ایک ٹکڑا بڑی محنت اور مشقت سے جمع کردہ سرمائے سے خریدا اور اس کی کاشت کر کے زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ انہی ایام میں میری شادی ہوئی۔ مگر وہ بالکل بے رونق اور روکھی پھیکی تھی۔ میرے لعل پھر تم پیدا ہوئے اور میرے دل کی تاریکیوں میں امید کی شمع جگمگانے لگی۔ تمہارے معصوم تبسم کو دیکھ کر میں اپنا غم بھول گیا مگر تمہاری پیدائش کے دو سال بعد موت کے بے رحم ہاتھوں نے

تمھاری ماں کو مجھ سے چھین لیا اور تاریک ایام پھر سے لوٹ آئے۔
میرا دل دنیا سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ مگر تمھاری وجہ سے میں اپنی مرضی
کے خلاف محنت و مشقت میں لگا رہا۔ اب تم جوان ہو اپنی بہتری سوچ
سکتے ہو۔ میں اس دنیا سے جا رہا ہوں اور یاس و حسرت کے سوا میرا
کوئی ورثہ نہیں .... خدا تمھارا مددگار ہے۔"
بوڑھے کا سانس پھول گیا۔ حیات نے اُسے آہستہ سے چارپائی
پر لٹا دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ کشمکشِ حیات سے چھوٹ کر اپنے
خالق سے جا ملا۔

مزدور کی عید

(از حسن دانش۔ بی۔ اے)

آج خلاف معمول شہر میں بڑی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ کارخانے ملیں
اور فیکٹریاں دوپہر ہی سے بند ہو گئی تھیں۔ لوگ عید کی تیاریوں میں
مشغول تھے۔ گلیوں اور کوچوں میں ایک شور برپا تھا آج چاند یقینی
تھا۔ کوئی درزی کی دوکان پر دوڑا جا رہا تھا۔ کوئی جوتے کی فکر
میں تھا۔ کوئی سویاں خریدنے کے لئے بازار لپکا جا رہا تھا۔ غرض سب
اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

اُدھر شہر میں ایسی ہل چل اِدھر سیٹھ کے مکان پر مزدوروں کا جماؤ۔ بیچارے مزدوری لینے کے لئے دوپہر سے سیٹھ کے مکان کا چکر لگا رہے تھے اور کیوں نہ لگاتے آج ہی کی مزدوری پر تو ان کی عید ہونے والی تھی۔

مزدوری ملی۔ کوئی بازار کی طرف چلدیا۔ کوئی مکان کو روانہ ہوا اسلم بھی انھیں مزدوروں میں سے تھا۔ اس نے بھی آج مزدوری پائی تھی۔ لیکن گھر میں سب کے لئے نئے کپڑے نہ بنوا سکا تھا۔ صرف اپنے ننھے جاوید کے لئے ایک نیا جوڑا سلوایا تھا۔ جو ابھی درزی کے ہاں تھا۔ باقی اسلم اور ننھے کی ماں کی عید دھلے ہوئے کپڑوں سے ہونے والی تھی۔

مزدوری لے کر اسلم نے ارادہ کیا کہ درزی کے یہاں سے ننھے کا جوڑا لیتا جائے۔ راستے میں اک شور سا مچا چاند ہو گیا" "وہ دیکھو میری انگلی کی سیدھ میں" "بال سے بھی باریک ہے"۔ اسلم نے بھی چاند دیکھا خاموش ہو گیا............ دوبارہ چاند کی طرف نظر دوڑائی اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ بے ساختہ زبان سے نکل پڑا

پیامِ عشق و مسرت ہمیں سناتا ہے ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

کئی منٹ تک خاموش بت بنا کھڑا رہا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کہ پیچھے سے اس کے ایک دوست نے آکر شانہ ہلایا۔ اور وہ چونک پڑا۔

"کیوں بھئی اسلم کیا سوچ رہے ہو؟" اسلم کے دوست نے سوال کیا۔
"کچھ نہیں۔ ذرا کچھ سوچ رہا تھا"۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اسلم! بازار نہ چلوگے۔ ذرا مجھے درزی کے یہاں سے کپڑے لینے ہیں"
"درزی کے ہاں تو مجھے بھی جانا ہے۔ لیکن تم چلو میں بعد میں آؤنگا
ذرا دریافت کر آؤں کیا کیا چیزیں خریدنی ہیں"۔ اسلم نے جواب دیا
اور گھر کا رُخ کیا۔

شام ہو چکی تھی ہر طرف قمقمے روشن تھے۔ سڑکوں پر لوگوں کی بھاگ
دوڑ سے کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ درودیوار سے کیف و سرور ٹپک رہا تھا
کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا تھا۔ لیکن اسلم کا دل ایک حساس دل
رکھنے والے شاعر کی طرح مغموم تھا۔ وہ خیالات میں کھویا ہوا قدم بڑھائے
مکان کی طرف چلا جا رہا تھا۔ کہ یکایک سامنے کے مکان سے آواز آئی۔
"میاں اسلم ذرا یہاں تو آؤ" دیکھا تو معلوم ہوا کہ مکان والا بلا رہا
ہے۔ قریب گیا اور سلام کر کے پاس کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

"اسلم دیکھو تم نے گزشتہ چار مہینوں کا کرایہ نہیں ادا کیا ہے۔ آج
حساب صاف کر دو۔ صبح عید ہے۔ مجھے بھی روپیوں کی سخت ضرورت ہے"
سیٹھ نے کہا۔

"سیٹھ جی"! اسلم نے بڑی منت اور آرزو کے لہجہ میں کہا۔
"سیٹھ جی ویٹھ جی کچھ نہیں مجھے روپئے چاہیے اور آج۔ ابھی۔ اسیوقت"
سیٹھ نے بات کاٹ کر کہا۔

"سیٹھ جی! سنئے تو۔ میں نے اس ہفتے صرف پانچ روپئے مزدوری
پائی ہے۔ ابھی ننھے کا کپڑا لانا ہے آپ ہی بتلایئے کیسے حساب چکتا کر دوں

جہاں اتنے دن آپ نے صبر کیا ہے ایک ہفتہ اور ٹھہر جائیے۔ انشاء اللہ آئندہ ہفتے ضرور حساب صاف کر دوں گا۔" اسلم نے ملتجیانہ انداز میں کہا "اجی تم ہمیشہ ہی کہتے آئے ہو۔ میں اب برداشت نہیں کر سکتا بچوں کے لئے کپڑے لاؤ چاہے مت لاؤ۔ مجھے اس سے کیا۔ مجھے روپے ابھی چاہئیں روپیہ بغیر ادا کئے تم ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتے۔" سیٹھ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

غیرت کے پتلے اسلم نے سیٹھ کی سخت و سست باتیں سنکر چار و ناچار پانچوں روپے سیٹھ کے حوالے کر دئے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دل بھر آیا لیکن سنبھلتا ہوا مکان آیا۔ بیوی انتظار کر رہی تھی ننھے جاوید نے باپ کو دیکھتے ہی شور مچایا۔ "ابا! ہمارے لئے نئے کپڑے نہیں لائے دیکھو احمد کے لئے اس کے ابا نے کیسے اچھے اچھے کپڑے بنوائے ہیں۔ ابا! صبح عید ہے۔ ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے لاؤگے کب ابا!"

"ابھی لاتا ہوں بیٹا تمھارے کپڑے درزی کے یہاں ہیں ابھی ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ اچھی طرح سل جائیں تو لاؤں بیٹا اب جاؤ سو جاؤ صبح پہن لینا۔"

بچے کو سمجھا بجھا کر اسلم نے سلا دیا۔ بیوی اسلم کی صورت دیکھ کر سمجھ گئی۔ پوچھا کیا بات ہے۔ اسلم نے چپکے سے سارا ماجرا کہہ سنایا عورت کا دل نازک ہوتا ہی ہے۔ زار و قطار رونے لگی۔ اب صبح وہ جاوید کو نئے کپڑے کہاں سے لا کر پہنائے گی۔ درزی بغیر پیسے نئے کپڑے نہیں

دیگا۔ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ دونوں کے لئے دُھلے ہوئے کپڑے موجود تھے۔ صرف جاوید کا جوڑا اس لئے نہیں دھویا گیا تھا۔ کہ اس کے لئے نیا جوڑا تیار کروایا گیا تھا۔ بیچاری نے صبر کی سل چھاتی پر رکھی اور اتنی رات کو ننھے کے کپڑے دھونے لگی۔ اور شوہر سے کہا کہ جاؤ ذرا آرام تو کر لو"۔

صبح ہونے کو تھی ستارے آخری ہچکی لے رہے تھے۔ مشرق سے سورج کی پہلی کرنیں نکل کر عروسِ صبح کو سنوارنے میں مشغول تھیں۔ کائنات جگمگا اٹھی۔ ہر چیز منور ہوگئی۔ گلیوں سے لڑکوں کے فلک شگاف قہقہے سنائی دینے اور دل میں چٹکیاں لینے لگے۔ جاوید بھی چونک کر اُٹھ بیٹھا باپ کے پاس آیا۔ پھر وہی نئے جوڑوں کا سوال۔ اسلم غریب کیا کرے بچے کو کیسے سمجھائے کیسے کہے اگر اس کا بس چلے تو وہ جاوید کے لئے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ آخر بچے کا دل کس طرح بہلائے اگر اس کا زور چلتا تو وہ دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز جاوید کے لئے مہیا کر دیتا مگر آہ! وہ مجبور تھا۔ صبح عید نے سب کے دلوں کو روشن کر دیا تھا لیکن اسلم۔ غریب اسلم کے دل میں تاریکی تھی۔۔ بھیانک تاریکی۔ کچھ سوجھتا ہی نہ تھا کہ کیا کرے۔ بیٹے کو کس طرح سمجھائے۔ آخر اپنے پاس بلا کر کہنے لگا۔

"بیٹا جاوید! تمھارے کپڑے میں درزی کے ہاں سے لے آیا ہوں لیکن انھیں ابھی مت پہنو۔ عیدگاہ سے واپس آکر پہننا۔ اور کھیلنے کے

لئے باغ میں چلے جانا۔ آؤ ابھی یہ دُھلا ہوا کپڑا پہن لو۔ ورنہ نیا جوڑا خراب ہو جائے گا۔ کیوں! ہے نا بیٹا! ہمارا جاوید بڑا نیک لڑکا ہے۔ ہم اس کو...... جاؤ بیٹا...... ارے ننھے کی ماں ننھے کو نہلاؤ تو۔

اسلم نے بہزار دقت بچے کو سمجھا کر وہی رات کا دُھلا ہوا جوڑا پہنا دیا اور عیدگاہ کی طرف جانے لگا۔ راستے میں دوسرے لڑکوں کو نیا جوڑا پہنے دیکھ کر جاوید ابا سے سوال کرنے لگا۔

"ابا! دیکھو ان لڑکوں نے تو نیا جوڑا پہنا ہے ہمیں کیوں نہیں پہنایا؟"

"بیٹا! اچھا بتاؤ تم اچھے لڑکے ہو یا بُرے؟"

"ابا! میں تو اچھا لڑکا ہوں"

"تو بس اچھے لڑکے ضد نہیں کرتے۔ بُرے لڑکے اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔

"تو کیا ابا! یہ سب لڑکے بُرے ہیں؟"

"ہاں بیٹا! یہ سب لڑکے بُرے ہیں۔ تم بہت نیک ہو۔ تم جب عیدگاہ سے لوٹو گے اور نیا جوڑا پہنو گے تو یہ لڑکے روئیں گے۔ ان کا جوڑا خراب ہو چکا ہوگا۔

"ابا! کپڑے اتنی جلد خراب ہو جائیں گے؟"

"ہاں بیٹا! دیکھو کیسے مٹی میں کھیل رہے ہیں۔ وہ دیکھو وہ لڑکا کیسا گرا۔ دیکھو تو کپڑے خراب ہو گئے نا؟"

"لیکن ابا......؟"

اسلم جاوید کے سوالات سے اُکتا گیا تھا۔ اس لئے اس نے بات کاٹ کر کہا۔

"بیٹا جاوید! عید گاہ جاتے وقت خاموش رہنا چاہیئے۔ ورنہ اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔"

غرض اسلم بیٹے کو سمجھاتا بجھاتا عید گاہ پہنچا۔ اور نماز ادا کرنے کے بعد گھر لوٹا۔ راستے میں پھر جاوید نے ضد کی اور مٹھائیاں خریدنے پر مصر ہوا۔ لیکن اسلم برابر اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلاتا ہوا مکان پہنچا۔ بیوی اپنی بیکسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ جاوید نے ماں کو روتا دیکھکر کہا۔

"ابّا! اماں بڑی وہ ہیں۔ عید کے دن بھی روتی ہیں۔!!"

"نہیں بیٹا! وہ ہنس رہی ہیں۔ جن لوگوں کو بہت خوشی ہوتی ہے وہ رونے لگتے ہیں۔"

"تو ابّا! میرے کیوں نہیں آنسو نکلتے۔ میں بھی تو بہت خوش ہوں؟"

"بیٹا! تم ابھی چھوٹے ہو۔"

"جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔ تو میرے بھی آنسو نکلیں گے؟"

"بیٹا دیکھو! اب بہت پریشان مت کرو۔ جاؤ تو ذرا باہر کھیل آؤ۔

ہاں جاؤ تو بیٹا۔ دیکھیں کتنی جلدی جاتے ہو۔"

اسلم بہت پریشان ہو چکا تھا اور ضبط کا دامن چھوٹ رہا تھا۔ رات کا بچا کھچا کھایا پیا اور خدا کا شکر بجا لایا۔ ابھی جگہ سے اٹھا بھی نہیں تھا

کہ پھر جاوید دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"ابا! ہمیں عیدی دو۔ ہم بازار سے مٹھائی لائیں گے۔ دیکھو ظفر کو عیدی میں دو آنے ملے ہیں۔

"ابا! دیتے کیوں نہیں؟"

اسلم کا دل بھر آیا بچے کو عیدی کہاں سے دے۔ زہر کھانے کو بھی گھر میں کوڑی نہ تھی"۔ آنکھوں سے دو موٹے موٹے گرم آنسو نکل کر گالوں پر آپڑے۔ یہی اس غریب بچے کی عیدی تھی۔ دو آنسو...... دو آبدار موتی۔

جاوید برابر ضد کرتا رہا۔ اور پھر نئے کپڑوں کے لئے فرمائش کرنے لگا۔ اب تو اسلم سے رہا نہ گیا۔ طبیعت سخت گھبرانے لگی۔ وہ اس زندگی سے موت کو بہتر سمجھتا تھا۔ ادھر بچے کی ضد اُدھر اپنی بیکسی سخت پریشان تھا کہ کیا کرے۔ آخر اس کی نظر ایک چمکدار چیز پر پڑی۔ اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چھری اٹھا اور ایک آہ کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو رہا۔

بیوی نے یہ سماں دیکھا رونے لگی۔ روتے روتے بیہوش ہو گئی۔... پھر ہوش میں آئی اور ضبط نہ کر سکی اور آخر اُسی خوفناک چھری کی مدد سے اپنے شوہر سے جا ملی۔

جاوید نے اس بھیانک منظر کو دیکھا۔ باپ کو پکارا۔ ماں کو آواز دی۔ رویا چیخا۔ چلایا۔ گھبرا کر بھاگنے لگا۔ کہ اچانک دروازے کی کیل سے ٹکرا گیا۔ ایسی سخت چوٹ آئی کہ جانبر نہ ہو سکا۔

تینوں روحیں دوسری دنیا میں جا ملیں۔ اس پاپی دنیا سے دور

.... بہت دور .... آج اسلم نے حقیقی عید منائی لیکن اس دنیا میں نہیں۔ اس مکار اور ظالم دنیا میں نہیں۔ جہاں سرمایہ داری کی حکومت ہے۔ جہاں مہاجنی راج ہے۔ بلکہ اُس دُنیا میں جہاں کے ذرّے ذرّے سے کیف و سرور ٹپکتا ہے۔ جہاں سرمایہ داری بے بس ہوتی ہے۔ جہاں کا ذرہ ذرہ تجلی ریز اور متبسم ہے۔ جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔

محبت کی قرباں گاہ پر

(از غوثیہ بانو ایڈیٹر ماہنامہ ضیا لکھنؤ ہمشیرہ عبدالرؤف صاحب عباسی ایڈیٹر حق لکھنؤ)

مجھے اس خیال خام سے باز آنا چاہیئے۔ مناسب یہی ہے کہ رضیہ کے والدین کو صحیح حالات سے مطلع کر دوں اور لکھ دوں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میری شریک حیات موجود ہے، اس کے بعد غالباً کیا یقیناً وہ اپنی لڑکی کو رخصت کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا نہیں مجھے ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ وہ وہاں سب انتظامات ہو چکے ہیں، دعوتی خطوط جاری کئے جا چکے ہیں۔ مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس لئے میرا انکار کسی طرح مناسب نہیں" انور اسی خیالات میں مستغرق دیر تک

اپنے کمرہ میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس کے بعد اپنی شریک حیات نوری کی تصویر ہاتھ میں لے کر کہنے لگا "پیاری نوری" میں نہ جانتا تھا کہ تو عورت نہیں فرشتہ ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے والدین نے میرے لئے ایک ایسا گوہر بے بہا تلاش کیا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں، افسوس اگر مجھے اس کا علم ہوتا اگر میرے بعض دوست نما دشمنوں نے تیری طرف سے میرے خیالات شادی سے پہلے ہی خراب نہ کر دئے ہوتے تو مجھ سے وہ حماقت سرزد نہ ہوتی کہ جس نے مجھے آج حیران و پریشان کر رکھا ہے ..... نوری ..... پیاری نوری۔ میرے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور نوری۔ تیرا نور بے قصور ہے۔ اس سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اُس کی ذمہ داری تیرے خاص اعزا پر عائد ہوتی ہے، اگر انھوں نے میرے کان تیرے خلاف بھرے نہ ہوتے، اگر میرے دماغ کو پراگندہ اور دل کو تجھ سے برگشتہ نہ کیا ہوتا تو آج میں تیرا اور صرف تیرا ہوتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ایک قصور اور جرم مجھ سے بھی سرزد ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے تجھے دیکھے اور پرکھے بغیر ..... دنیا کی بد ترین عورت تصور کر لیا۔ اور اس غم وغصہ میں۔ میں نے تیرے والدین کو سزا دینے اور تجھے جلانے اور ستانے کی غرض سے ایک دوسری عورت کو بھی تیرا شریک بنانے کا فیصلہ کر لیا مگر جب میں نے تجھے دیکھا۔ پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے ارادہ کیا کہ دوسری شادی کے خیال کو ترک کر دوں مگر دلہ قسمت بھڑکانے والوں نے مجھے پھر بھڑکایا۔ مجھ سے کہا گیا کہ تو اوامر ہے

بدلا طوار ہے اور ایک ایسی عورت ہے کہ تجھے ننگ شرافت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ میں اُن لوگوں کی باتوں میں آگیا اور اُن لوگوں کے اصرار سے میں نے رضیہ کے ساتھ نکاح بھی کرلیا۔ اور اسی ہفتہ میں رخصتی ہے۔ تو ہی بتا کہ کیا کروں؟ پھر وہ خاموش ہوگیا۔" اور اضطراری کیفیت میں ٹہلنے لگا۔ اسی اثنا میں خادمہ نے آکر اطلاع دی کہ چاء تیار ہے اور بیگم صاحبہ منتظر ہیں۔" ابھی آیا" انور نے جواب دیا۔"

چاء کی میز پر نوری اور انور بیٹھے ہیں۔ لیکن دونوں خاموش ہیں۔ دیر تک یہی کیفیت طاری رہی۔ آخر کار نوری نے مہر سکوت توڑی اور مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

پروفیسر صاحب بات کیا ہے۔ آپ اس وقت خلاف معمول خاموش کیوں ہیں؟

انور :۔ (نوری کو غور سے دیکھ کر) کوئی خاص بات نہیں میرے ایک دوست کا خط آیا ہے۔ انھوں نے بہت اصرار سے اپنی شادی میں مجھے بلایا ہے۔ سوچتا ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ اگر جاتا ہوں تو مشکل ہے اور نہیں جاتا تو مشکل ہے۔ اسی کشمش و پیچ میں ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟

نوری :۔ شادی میں شرکت تو کوئی ایسی بات نہیں کہ جو انسان کو آپ کی طرح پریشان کردے (انور (بات بناتے ہوئے) تم جانتی ہو کہ میرے پاس ہندوستانی کپڑے نہیں ہیں۔ اور سوٹ پہن کر وہاں جانا مناسب

نہیں، اس کے علاوہ مجھے شادی کے تحائف بھی لے جانا چاہیئے۔ اس لئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عذر کردوں۔

نوری :۔ آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ نہ جانے کا تو نام ہی نہ لیجیئے کیوں کسی کے ارمانوں کا خون کیجیئے۔ جہاں تک کپڑوں کا تعلق ہے ان کے لئے پریشان نہ ہوئیے۔ کیونکہ جو کپڑے آپ کو شادی کے موقع پر ملے تھے وہ سب ہندوستانی ہیں۔ اور جوں کے توں رکھے ہیں۔ اب فرمائیے کہ آپ کو اور کن چیزوں کا انتظام کرنا ہے؟ تحائف کا بھی انتظام کردونگی"۔

انور :۔ (ہنس کر) شکریہ۔ تمام میری مشکلات حل کردیں۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ جو لباس آپ نے میرے واسطے تجویز کیا ہے۔ یہ اب مجھ پر زیب بھی دے گا۔ شادی تو میرے دوست کی ہو اور دولھا میں بنوں۔

نوری :۔ دوست تو آپ کے ہی ہیں پھر کیا جرم ہے۔ کہ اگر وہ اپنا عکس آپ میں دیکھ لیں۔

انور :۔ خیر صاحب یونہی سہی۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ میری عدم موجودگی میں تم گھبراؤ گی تو نہیں میں جدائی کے دن بڑی مصیبت سے گزاروں گا اور اصل میں زیادہ فکر مجھے یہی ہے۔

نوری :۔ (آبدیدہ ہو کر) آپ کی محبت کا شکریہ، میری تنہائی کا آپ خیال نہ کریں۔ آپ کی یاد میرا دل بہلائے گی۔ آپ کا تصور میری دلبستگی کا باعث ہوگا۔ آپ کی محبت رنگین و پربہار خواب میری تشفی کریں گے آپ اطمینان رکھئے میں خوش ہوں اور انشاءاللہ ہمیشہ خوش رہوں گی۔

یہ کہتی ہوئی وہ کھڑی ہوگئی ۔ اور ساتھ ہی انور بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

(۲)

کئی روز قبل ہی سے انور جانے کے انتظام میں مصروف ہو گیا اور نوری بھی اس کی تیاریوں میں اس کا ہاتھ بٹا رہی ہے ۔ گو کہ دل کی بیتابی اس کو بدحواس کئے ہے ۔ اور آنسو اُمنڈ امنڈ کر راز دل عیاں کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ لیکن اس نے بڑی ہمت اور استقلال کے ساتھ اپنے قلبی جذبات کو پوشیدہ رکھا ۔ حالانکہ اس کا دل رو رہا تھا لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی ۔ انور جب جانے کے واسطے تیار ہو کر آئینہ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا ۔ تو نوری لڑکھڑاتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور کہنے لگی میں ایک التجا لے کر حاضر ہوئی ہوں ۔ کیا امید کروں کہ آپ اُسے رد نہ کریں گے ۔

انور (گھبرا کر)، "خیر تو ہے، یہ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو میں نے کبھی تمہاری کوئی بات رد کی ہے، التجا کیسی ۔ تم مجھے حکم دے سکتی ہو کہو کیا کہنا چاہتی ہو ۔

نوری (ضبط کرتے ہوئے) آپ کے دوست کی شادی ہے، آپ اُنھیں دولھا بنے دیکھیں گے مجھے رشک آ رہا ہے ۔ میں چاہتی تھی کہ میں آپ کو دولھا بنا کر دیکھ لیتی یہ کہکر جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے پھولوں کا ایک بڑا گجرا انور کے گلے میں پہنا دیا ۔ اور وہ بنارسی صافہ جو نوری کے والد نے انور کو شادی کے موقع پر دیا تھا اپنے ہاتھ سے اسکے

سر پہ باندھ کر خوبصورتی سے ایک ہار اس کے گرد لپیٹ دیا۔ اور نہایت حسرت سے کچھ دور رہ کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر خاموشی سے کمرہ کے باہر نکل گئی۔ انور اس کے یہ حرکات حیرت اور سکوت کے ساتھ دیکھتا رہا اور پھر اس کے پیچھے خود بھی نوری کے کمرہ میں پہنچ گیا، دیکھا کہ وہ ایک اٹیچی کیس میں کچھ بہت عجلت سے رکھ رہی ہے۔ انور کو دیکھ کر کہنے لگی کہ آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آ رہی تھی خیر یہ حقیر تحفہ آپ میری جانب سے میری بہن کو دیدیجیئے گا۔

انور:۔ میں بھی تو دیکھوں کہ کیا بھیجا جا رہا ہے۔

نوری:۔ بہت ہی مختصر سامان ہے۔ ایک ساڑی کا سیٹ، کچھ آئرنگ کلپ اور ایک انگشتری ہے۔

انور:۔ اس قدر سامان کی کیا ضرورت تھی۔

نوری:۔ کچھ زیادہ تو نہیں۔ ہاں جس وقت میں خود دیکھوں گی اس وقت بیشک جو کچھ میسر ہوگا وہ دوں گی۔

انور:۔ خیر خوشی تمھاری اچھا اب اجازت ہے۔

نوری:۔ (دل سنبھال کر) خدا حافظ۔

(۳۲)

نوری اپنے ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھی چپکے چپکے کچھ گا رہی ہے، کہ ملازم ڈاک لے کر حاضر ہوا، سلام کیا۔ اور اُسے سامنے میز پر رکھ کر واپس گیا، نوری لاپرواہی سے اخبار کو ایک ایک کرکے اُٹھانے لگی۔ دفعتاً

اس کی نظر لفافہ پر پڑی جو اس کے شوہر انور کے نام تھا۔ اس نے اس کو اُٹھا لیا۔ پہلے لفافہ کو غور سے دیکھا پھر احتیاط سے لفافہ کو کھول کر خط نکالا اور پڑھنے لگی، خط پڑھتی جاتی ہے اور چہرہ کا رنگ متغیر ہوتا جاتا ہے بمشکل تمام اس نے اُسے ختم کیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے ملفوف کر کے میز پر ڈال دیا۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں۔ یا اللہ یہ کیا تماشا ہے اُف کس قدر حسین فریب ہے لیکن یہ میں نے بُرا کیا کہ ان کے نام کا خط کھول ڈالا۔ مفت گناہگار ہوئی۔ جو راز انھوں نے مجھ سے پوشیدہ رکھا تھا اسکو معلوم کرنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا، یا اللہ میں کیا کروں، خداوندا تو مجھے معاف کر دے، اگر ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ان کے راز سے واقف ہو گئی ہوں تو یقیناً مجھ سے بیزار ہو جائیں گے۔ لیکن اب مجھے کرنا کیا چاہیئے آیا ان کا طلسم درہم و برہم کر دوں یا ان کی مسرت گاہ پر اپنی جان بھینٹ چڑھا دوں۔ مگر کتنا پیارا دھوکا ہے کہ ظالم نے اپنے کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا اور فریق ثانی بھی کس قدر بھولے ہیں کہ انھوں نے بغیر کچھ تحقیق کئے یقین بھی کر لیا، اور فوراً نکاح کر کے رخصتی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ کیا ان کی لڑکی میں کوئی فیہ ہے۔ خیر جو کچھ ہو۔ میں ان کی خوشی میں مخل نہ ہوں گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کی فطرت میں ایثار ہوتا ہے۔ دیکھوں مجھ میں بھی یہ جوہر ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو میں بھی ان کی خوشی پر اپنا آرام اپنی مسرتیں اپنا عیش، اپنا قلبی سکون سب کچھ نچھاور کر دوں گی، اور

ہرگز کوئی بات ان پر ظاہر نہ ہونے دوں گی! دل میں حسد کے شعلے بھڑک رہے ہیں، بھڑکیں، یہ مجھے جلا سکتے ہیں۔ لیکن ان تک اس کا دھواں بھی نہ پہونچنے دوں گی۔ بس یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔ خداوندا تو مجھے ہمت دے استقلال دے۔ اور ضبط کی طاقت دے کہ میں ہنستے کھیلتے اپنے حقوق سے دست بردار ہو جاؤں، اللہ تعالیٰ تو یہ میرا ایثار قبول کر۔

آہ آہ! پرسوں مجھے اُن سے دست بردار ہو جانا پڑے گا، وہ کسی اور کے زلف کے اسیر ہو جائیں گے کیسی خوش نصیب وہ ہستی ہے کہ جس کے وہ اب ہو رہے ہیں۔ لیکن میں بھی کس قدر احمق ہوں کہ آج تک ان کی فطرت کو سمجھ ہی نہ سکی، کس قدر مطمئن اور نازاں تھی، ان کی محبت پر سمجھتی تھی کہ وہ صرف میرے ہی ہیں۔ اور میرے ہی رہیں گے۔

مردوں کا قول ہے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ اور ان کی فطرت میں مکاری، ظاہرداری اور خود غرضی ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مردوں کے فریب میں ہرگز نہ پھنستیں۔ ان کے گلشنِ محبت کی سیر کرتیں لیکن سنبھل کر .... باقی اور خوبیاں تو میں جانتی ہوں کچھ مردوں ہی میں زیادہ ہوتی ہیں، اور ہونا بھی چاہئے کیوں کہ مرد ہر صورت سے عورت پر سبقت رکھتا ہے۔ ہم بیچاریاں یہ عقل و سمجھ کہاں سے لائیں جو مصنوعی بیل بوٹے بنا کر کسی کو یقین دلائیں کہ یہ سدا بہار باغ ہے۔ اس کو نہ خزاں کا خوف ہے نہ باد سموم کا خدشہ۔

(۴۸)

انور کو سسرال آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اور اب واپسی کے دن قریب تھے۔ لیکن وہ حیران تھا کہ جس اسٹیج پر اب تک وہ ایک کامیاب ایکٹر کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ سین بدلنے پر اس کو کیا کرنا ہوگا آج وہ کس کا پارٹ لے گا۔ رضیہ کے حسن وجمال کا وہ دیوانہ ہو چکا ہے لیکن نوری کی بھی سادہ ادائیں، بھولی باتیں اور نشیلی آنکھیں وہ ابھی فراموش نہیں کر سکا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ نہ رضیہ کو ساتھ لے جائے بنے اور نہ چھوڑے بہرحال وہ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ کہ اُسے اس کے ایک دوست کی معرفت نوری کا خط ملا ہے جسے اس نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لیا کھولا پڑھا۔ خط کا مضمون یہ تھا :-

تجھ سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں، جب سے آپ گئے ہیں خیریت نہیں معلوم ہوئی جس سے از حد پریشان ہوں۔ خدا کرے بجز میری بدقسمتی کے اور کوئی وجہ مانع نہ ہو۔ ہاں آپ کو عروس نو مبارک ہو۔ اور خدا کرے یہ جوڑی ہمیشہ خوش وخرم شاد وآباد رہے۔ آپ اطمینان رکھئے مجھے آپ سے نہ کوئی شکایت ہے نہ کبھی ہو گی، اچھا کیا کہ آپ نے میری محبت پامال کر دی۔ خوب کیا کہ مجھ ناشاد کو ٹھکرا کر میری یاد اپنے صفحۂ دل

سے مٹا دی۔ مجھے گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں، آپ حاکم ہیں اور میں محکوم یقیناً کوئی کمزوری اور کوئی عیب مجھ میں ایسا ہو گا۔ کہ جس نے آپ کو اپنے اس وعدہ سے پھرنے پر مجبور کیا۔

"نوری یہ دل تمھارا ہے۔۔۔۔ تم ہی اس کی مالک ہو اور ہمیشہ رہو گی" آہ کس قدر میں آپ کے اس وعدہ پہ نازاں تھی بھولے سے بھی خیال نہ آتا تھا کہ یہ ایک پیارا فریب ہے۔ یہ ایک دلفریب خواب ہے جس کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔ آہ یہ قصور میری قسمت کا ہے، میری عقل کا ہے کاش اس خواب سے بیدار کرنے سے پہلے، محبت کا لہلہاتا ہوا پودا قلم کرنے سے پیشتر میری امیدوں کا خون کرنے سے قبل آپ نے میری اس کمبخت زندگی کو ختم کر دیا ہوتا۔ لیکن خیر جو آپ نے مناسب سمجھا وہ کیا اب خدا مجھے توفیق دے کہ میں اس خوش نصیب و رقابل فخر ہستی کی خدمت اپنا فرض سمجھوں۔ اب آپ مع اپنی بیگم کے جلد تشریف لائیے۔ میں آپ لوگوں کی دل و جان سے منتظر ہوں۔ زیادہ بجز شوق ملاقات کے کیا عرض کروں ؎

اچھا کیا جو آپ نے مجھ کو بھلا دیا
وابستہ میری ذات سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

بد نصیب نوری

شب کے نو بج چکے ہیں، چاند اپنی پوری آب و تاب سے آسمان و زمین کی گنجائشوں کو بقعۂ نور بنائے ہوئے ہے۔ نوری بھی کسی کے انتظار میں بے قرار تھی، آنسو آنکھوں سے جاری تھے اور سرد آہیں دم گھوٹے

دے رہی تھیں مگر آنکھیں بدستور کسی کا راستہ دیکھ رہی ہیں۔ نگاہ کبھی پھاٹک پر ہے اور کبھی کلائی کی گھڑی پر، ادھر گھڑی نے ساڑھے نو بجائے اور کسی کا موٹر ہارن دیتا ہوا پھاٹک کی جانب آتا نظر آیا نوری سنجیدگی کے ساتھ مسکراتی ہوئی استقبال کو بڑھی۔ انور نے نوری کو آتے دیکھ کر موٹر پھاٹک ہی پر روک دی اور خوبصورت بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اُتر پڑا اور جلد جلد قدم رکھتا نوری کی جانب بڑھا، جونہیں انور اور بیگم کی نظر نوری کے اُترے لیکن مسکراتے ہوئے چہرے پر پڑی۔ وہ ایک دم انور کا ہاتھ چھوڑ کر الگ ہو گئی۔ اور دونوں چند سکنڈ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتی رہیں۔ اور پھر

وہ رضیہ، "میری پیاری نوری تو یہاں کہاں" کہتی ہوئی بڑھی اور نوری کی گلے لگ گئی، دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انوار حیرت سے ان دونوں کے خلوص کے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ آخر بڑھ کر دونوں کو علیحدہ کرنا چاہا لیکن نوری انور کا مطلب سمجھ کر خود ہی تڑپ کر علیحدہ ہو گئی اور رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی۔

"پیاری رضو" عرصہ کے بعد تمھیں دیکھا، یہ ایسی اتفاقیہ ملاقات ہے کہ جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا، جو خوشی ہوئی ہے وہ میرا دل ہی جانتا ہے، چلو پہلے منھ ہاتھ دھو کر چائے پی لو۔ پھر باتیں ہوں گی۔

رضیہ:۔ چاء تو بعد کو پی جائے گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کہاں؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں، تم مجھے چھوڑ کر کہیں چلی تو نہ جاؤ گی، پروفیسر

صاحب خدا کے واسطے بتائیے کہ یہ میرا گم شدہ ہیرا آپکو کیونکر مل گیا۔
نوری (بھرائی ہوئی آواز میں) ہوش میں آؤ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ تمھارا خواب نہیں بلکہ بیداری ہے، اور یوں تو دنیا ہی خواب وخیال ہے مفصل باتیں اب صبح کو ہوں گی۔ تم مجھے یہاں دیکھ کر متعجب نہ ہو، انور صاحب سے اور بھائی صاحب سے ایک عرصہ کے مراسم ہیں تبدیل آب وہوا کی غرض سے یہاں آئی تھی۔ اب تک واپس چلی گئی ہوتی لیکن انور صاحب کی بیگم کے اشتیاق کی بیتابی نہیں ہے بلکہ اپنی بچھڑی ہوئی سہیلی کے ملنے کی بے قراری تھی، کہو چچا اور چچی صاحبہ کا مزاج تو بخیریت ہے تم سب نے تو ایک عرصہ سے وطن ہی چھوڑ دیا۔ اور خط لکھنا تو تمہیں آتا ہی نہیں۔

رضیہ:۔ خوب! یہ الٹے شکوے، میں اس قدر سخت بیمار رہوئی۔ کہ بچنے کی امید نہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ تمھاری شادی میں شرکت نہ کرسکی پھر کشمیر چلی گئی وہاں سے واپسی پر کئی خط تم کو بھیجے لیکن تم نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ آج تک مجھ کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خوش قسمت ہستی کون ہے اور کہاں ہے کہ جسکی تم جان کا جنجال یا گلے کا ہار ہوئیں۔
نوری نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا۔ یہ سب کچھ صبح کو معلوم ہوگا اب تو نیند بھی آرہی ہے اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔

(۵)

صبح خیریت سے ہوئی۔ ملازم حسب معمول اپنا اپنا کام انجام دے

رہے ہیں رضنیہ اور انور بھی بیدار ہو چکے ہیں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر رضنیہ ڈریسنگ روم میں بیٹھی بال بنا رہی ہے اور بار بار دیکھنے لگتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی منتظر ہے آخر زیادہ انتظار نہ کر سکی ملازم کو طلب کر کے اس سے دریافت کیا کہ بیگم صاحبہ ابھی بیدار ہوئیں یا نہیں اور پروفیسر صاحب کہاں تشریف رکھتے ہیں۔

ملازم :۔ بیگم صاحبہ بہت سویرے اُٹھنے کی عادی ہیں لیکن خلاف معمول آج اب تک وہ برآمد نہیں ہوئیں، لیکن سرکار انہی کے کمرہ میں ابھی تشریف لے گئے ہیں۔

رضنیہ :۔ اچھا تو مجھے ان کے کمرہ میں لے چلو، ملازم :۔ تو اچھا تشریف لے چلیے۔

رضنیہ (نوری کے کمرہ میں دروازہ پر رُک کر، میں آسکتی ہوں نوری؟ جواب نہ پا کر۔ رضنیہ گھبرا کر کمرہ میں داخل ہو گئی۔ دیکھا تو وہاں نوری کا پتہ بھی نہیں۔ ہاں انور بیشک ایک خط ہاتھ میں لئے بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔

رضنیہ :۔ بیتابی سے خط چھین کر پڑھنے لگی لکھا تھا،

"گذری ہوئی شب کے سُہانے خواب کی بھیانک تعبیریں اب زیادہ دیر تک پسِ پردہ نہیں رہ سکتیں،

انور صاحب آپ قیامت کے کھلاڑی ہیں۔ اور آپ کا طرز عمل غضب کا دلچسپ ہے۔ اور نظر فریب، مجھے کوئی شکایت آپ سے نہ کبھی تھی اور نہ اب ہے۔ جو کچھ آپ نے کیا وہ میرے برگشتہ مقدر کی خوبی تھی خودکشی آسان ہے اگر خوف خدا نہ ہوتا۔ میں مجبوراً آپ کے قدموں سے علیحدہ ہو رہی

ہوں۔ رشک سے نہیں اپنے شریک دار کے خیال سے نہیں۔ بلکہ محض اپنی پیاری رضیہ کی دل شکنی کے خیال سے کیونکہ وہ ہرگز اپنی آزاد محبت کی منزل میں کسی دوسرے کی شرکت پسند نہ کرتی، کیونکہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ وہ تنہا آپ کی اور اس گھر کی ملکہ ہے، ظاہر ہے کہ اگر اس کی امیدوں کے خلاف ہوتا تو کس قدر اس کو تکلیف ہوتی اور اس کی محبت عداوت سے بدل جاتی، بچپن سے اس کی فطرت میں رشک ہے، وہ اپنے ملنے والیوں کی دوسری دوستوں کو پسند نہ کرتی تھی۔ لہٰذا وہ کس طرح میرا ساتھ گوارا کرتی اور آپ کی محبت کھو کر اس کی سچی محبت سے ہاتھ دھونا مجھے منظور نہیں، میں بخوشی اپنے حقوق سے دست بردار ہوتی ہوں آپ میری تلاش کی زحمت نہ کیجئے گا۔ اب میں کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی عبادت میں زندگی کے بقیہ دن ختم کر دوں گی، دعا کیجیے کہ خدا میری زندگی عزت کے ساتھ گزار دے، اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ خدا میرے ساتھ ہے اور آپ کا خیال میری رہنمائی کرے گا۔

انور صاحب یہ یاد رہے کہ محبت اگر کسی کو کسی سے ہوتی ہے تو صرف اسی سے نہیں ہوتی بلکہ اس سے زیادہ اس کے خیال سے ہوتی ہے۔ میرا یہ ایثار خدا قبول کرے اچھا خدا حافظ۔

آپکی شکستہ دل - نوری

خط کے دوسری طرف تحریر تھا۔ پیاری رضو، انور صاحب تم کو اور تم ان کو مبارک! خدا تم دونوں کو شاد رکھے تمھارے گلشنِ محبت میں جو

خار تھا شکر ہے وہ نکل گیا۔ تم رنج نہ کرنا۔ دنیا نام ہے فریب کا۔ اس کی حقیقت تم پر ظاہر ہو گئی ہے۔ اب افسوس کرنا بے کار ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا مجھے امید ہے کہ تم اپنی صورت و سیرت سے انور صاحب کے دل پر حکومت کرو گی، اور کوئی بات ایسی نہ کرو گی کہ جوان کی تکلیف یا رنج کا باعث ہو گی، اچھا خدا حافظ۔ وقت بہت کم ہے۔

تمھاری پیاری۔ نوری

رضیہ خط پڑھتے ہی سن ہو گئی اور بہت دیر کے بعد اسکی زبان سے صرف یہ الفاظ ادا ہو سکے۔ آہ انور صاحب میری پیاری معصوم نوری اور محبت کی قربانگاہ پر۔

حسین راتیں

شعیب انصاری آفتاب بھوپال

پانی کی اٹھتی ہوئی بیتاب لہریں۔ سینۂ دریا پر کروٹیں بدل رہی تھیں ایک اور ماہتاب زریں چادر آب پر کروٹیں بدل بدل کر نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رہا تھا۔ ہوائے خوش گوار نوخیز کلیوں کو گدگداتی پھولوں سے اٹھکھیلیاں کرتی اپنے مستانہ جھونکوں سے اشجار کو بید مجنوں کی طرح لرزا رہی تھی۔ فضائے لطیف طرح طرح کے گلوں کی خوشبو سے معطر تھی فلک سے جھانک کر حسین و مختصر ستارے مسکرا رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ایک سا

لطیف و روح افزا سکوت کائنات پر طاری تھا پھول اور درختوں کی پتیاں کسی خاموش نغمہ میں کھوئے ہوئے تھے .... کتنی حسین رات تھی وہ جب ندی کے کنارے کوئی پانی میں پانوں ڈالے ہوئے مدھر لے میں بنسری بجا رہا تھا۔

وہ مدھ بھرے سر پہاڑوں سے ٹکرا کر صدائے کیف آگیں پیدا کر رہے تھے۔ ہر سننے والے کا دل چھین لینے کے لئے اس کا رسیلا نغمہ کافی تھا۔ اس کے چہرے پر پڑے ہوئے گیسوے خمدار لہرا رہے تھے نازک نازک لبوں پر وہ خوبصورت بنسری ...... کتنی حسین تھی۔ وہ رات .... اس وقت ایڈیٹر کسی خیال میں منہمک اپنے صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا فضائے خوشگوار اس کے دامن کو چھو چھو کر گدگدی پیدا کر رہی تھی۔ مدہوش کائنات خواب شیریں سے لطف اندوز تھی۔ سروج خیالات کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا نئے نئے تغیرات اس کے چہرے پر پیدا ہو رہے تھے طوفان کی بدلیاں امنڈ امنڈ کر آرہی تھیں۔ ایک طوفان خیال آتا اور ایک بگولہ بنکر چلا جاتا صورت پر کچھ اداسی۔ کبھی لبوں پر تبسم کی لہریں وہ تنہا کسی خیال میں مستغرق تھا۔ وہ کسی کے جلووں کے لئے بے قرار تھا۔ اس کی ......

...... اس کی بے قرار نگاہیں ادھر اُدھر اُٹھ رہی تھیں۔ وہ بنسری کے دل خوش کن آواز محسوس کر رہا تھا۔ وہ وقت جس کا سروج انتظار کر رہا تھا ابھی بہت دور تھا۔ عرصۂ انتظار میں ایک ایک لمحہ ایک

ایک سال کے برابر معلوم ہو رہا تھا۔ یہ وقت جلد گزرتا کیوں نہیں"
وہ سوچ رہا تھا کہ گھڑیال نے یکے بعد دیگرے بارہ بجائے ایڈیٹر نے
گھڑی کی طرف گھور کر دیکھا اور چند لمحات کے لئے وہ نظریں گھڑی پر
جمائے رہا اس نے سر کے لانبے لانبے بالوں کو جو چہرے پر پڑے ہوئے
تھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ " دیوی کتنی حسین ہو تم! کیا میں تم سے اظہار محبت
کر سکتا ہوں۔ نہیں..... ہرگز نہیں۔ تمھارے رعب حسن سے میرے
لبوں پر مہر سکوت خود بخود چسپاں ہو جاتی ہے۔ میں اپنا افسانۂ غم سنا نا
چاہتا ہوں مگر میرے لب .... کیا میں تم سے یہ کہہ سکتا ہوں
کہ تم بھی میری طرح شب بھر بے قرار رہتی ہو۔ شیلا یہ میری محبت کی
پہلی منزل ہے۔ نہ جانے مجھے اس جیسی کتنی اور منزلیں طے کرنا ہوں گی
میں آج اپنی قسمت کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔ اس وقت جبکہ تم مجھ سے
یہ کہو گی۔ سروج مجھے تم سے پریم ہے تو اس وقت میں خیال کروں گا دنیا
میری ہے۔ اور مجھے اپنی قسمت پر ناز ہو گا۔ کیا تم یہ جان سکتی ہو کہ مجھے
تم سے کتنا پریم ہے۔ یہ چاند ستاروں اور ہوا سے پوچھو تمھارے پیارے
نام سے مجھے کتنی انسیت ہے........ سروج نے اپنی نگاہیں اٹھا کر
دیکھا۔ یہ وہی وقت تھا جس کا سروج کو بہت دیر سے انتظار تھا
مکان کے تمام لوگ بے خبری کے عالم میں سو رہے تھے۔ وہ دروازہ کی
طرف بڑھا اسکا چہرہ بشاش تھا۔ اس نے پردہ ہٹایا پردہ کو ایک حرکت
ہوئی دروازہ سے گزر کر وہ مکان کے باہر آیا اس کے قدم جلد جلد اٹھ

رہے تھے۔ اور کوئی شے اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔
"یہ کتنا اچھا دلکش نغمہ ہے! بنسری بجانے میں تم کتنی ماہر ہو۔
تمہارے اس نغمہ نے میری رگ رگ کو مضطرب بنا دیا۔ میرا دل کہہ رہا
ہے تم بنسری بجائے جاؤ" ان ہی مدھ بھری صداؤں میں سروج اب
قریب پہنچ چکا تھا۔ اس میں اور شیلا میں بہت تھوڑا فاصلہ تھا۔ اسنے
دیکھا۔ شیلا پانی میں پانوں لٹکائے ہوئے بنسری بجا رہی ہے وہ اتنی
بے خبر ہے کہ اسے مطلق علم نہیں کہ سروج کھڑا ہوا بنسری سن رہا ہے۔
شیلا کے کچھ گیسو اس کے سرخ رخساروں پر پڑے ہوئے تھے۔
شیلا نے بنسری بجانا ختم کر دیا اس نے گھوم کر دیکھا تو سروج کھڑا تھا
اس نے ادائے معصوم سے انگڑائی لیتے ہوئے ایک ہلکی سی مسکراہٹ
کے ساتھ بنسری کو سبزہ پر پھینکدیا۔ اس وقت سروج بت بنا کھڑا
تھا جو کہ بنسری سن رہا تھا۔ یکایک وہ چونکا "ہاں ہاں شیلا اسی طرح
بھولے پن سے میرا دل کہہ رہا ہے بجاؤ! تم اسی طرح بجائے جاؤ اور میں
اسی طرح کھڑا اسنتا رہوں۔ وہ ہی بے خودی کے عالم میں اس نے
محبت بھرے الفاظ میں کہا "شیلا شیلا بنسری کیوں بند کر دی مجھے
بہت پسند ہے کتنا محبت بھرا نغمہ ہے یہ"
شیلا نے کہا "کیا تمھیں بہت پسند ہے" "ہاں"۔ سروج نے کہا۔
"صرف تمھاری بنسری کا نغمہ ہی نہیں بلکہ تم بھی" شیلا نے سر جھکا کر
شرماتے ہوئے کہا "آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں" سروج نے

کیا میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہیں تمھاری شان کے خلاف نہ ہو مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اگر تم میری گستاخی معاف کرو۔" اس نے کانپتے ہوئے پوچھا "کیا شیلا تم مجھ سے پریم کرتی ہو؟ وہ شیلا کے جواب کا منتظر تھا۔

شیلا نے محبت بھرے الفاظ میں کہا "ہاں مجھے تم سے پریم ہے اور اتنا جتنا کہ ایک چکور کو چاند سے ہوتا ہے، سروج کے دل کی کلی کھل گئی بہت دیر کے بعد سروج نے کہا آج میں بہت خوش ہوں۔ شیلا۔ آج میں سمجھتا ہوں کہ مجھے محبت بھرے دل کی دنیا مل گئی۔ کتنا خوش ہوں میں آج کی رات کتنی حسین ہے۔ چاند اور ستارے ہم پر مسکرا رہے ہیں۔ اور یہ منظر کتنے دلفریب معلوم ہو رہے ہیں۔ وہ دن بہت قریب ہے جب ہم اور تم ایک رشتہ میں منسلک ہو جائیں گے۔ وہ خوشی کے مارے ناچنے لگا۔ شیلا چپ چاپ وہاں سے چلدی۔ اس نے کہا شیلا تم بھی خوش ہو نہ" "ہیں" "شیلا۔ شیلا۔ تم کہاں چلی گئیں۔ ابھی تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا تھا۔ افسوس اب کیا کروں؟ تم کہاں غائب ہو گئیں۔

شیلا تم کیوں چلی گئیں۔ کیا تم خوش نہیں ہو........؟ اس نے بہت دور جھاڑیوں میں ایک خوفناک چیخ کی آواز سنی۔ سروج کے دل کو سخت صدمہ ہوا۔ یہ کس کی چیخ تھی۔ سروج نے بہت غور کیا لیکن سب لاحاصل۔ وہ اس چیخ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ قریب آچکا تھا لیکن اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس نے کچھ دور فاصلہ پر پھر وہی چیخ سنی۔

"مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو" کسی نے گرج کر غصہ کی حالت میں کہا۔ "کتنی نادان ہے تو۔ تجھے کسی کی عزت کا خیال نہیں" سروج پھر اسی طرف روانہ ہوا۔ وہ ایک کھلے ہوئے میدان میں تھا۔ اس نے بہت فاصلہ پر دو قسم کے سائے دیکھے جو جلدی ہی نظروں سے غائب ہوگئے وہ کھڑا بحر تفکر میں غوطے لگا رہا تھا۔ اس واقعہ کو گزرے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ ان دونوں کی ملاقاتوں کے درمیان سروج نے شیلا سے کئی مرتبہ اس خوفناک چیخ کے متعلق اور اس کے یکایک غائب ہو جانے کا سبب دریافت کیا لیکن شیلا نے اسے کچھ نہ بتایا اس پر سروج کو بہت صدمہ ہوا۔ اسی نے اس کی تمام مسرتوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور وہ نہ جانے شیلا کے متعلق کیا کیا خیالات کرنے لگا ایک دن کا ذکر ہے کہ سروج اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ایک مجسمہ بنا رہا تھا اور اس کام سے حد درجہ دلچسپی لے رہا تھا۔ بے خبری کے عالم میں دروازہ بند کرنا بھول گیا سروج کا یہ روزانہ کا دستور تھا کہ وہ اس مجسمہ کو روزانہ تھوڑا تھوڑا بناتا اور آج بھی اسے بنا رہا تھا.... آج آخری دن تھا۔ جبکہ وہ اس مجسمہ کو بنا کر تیار کر لیتا اس کو وہ بہت محفوظ طریقہ سے رکھتا....... محبت کے اس راز کو کئی دن سے چھپائے ہوئے تھا۔ اسے اپنی محبت کے راز کے افشا ہونے کا مطلق خیال نہ تھا۔ کمرے کے دروازہ کو یکایک آہٹ ہوئی اور کمرے میں کوئی داخل ہو گیا۔ یکایک سروج چونک پڑا اس کے ہاتھ سے وہ مجسمہ گر کر ٹوٹ گیا۔ ایک دردناک آواز میں اس نے کہا۔

"آہ شیلا!"

سروج نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "اوہ مسٹر سریش۔ بیٹھیے بیٹھیے"

سریش نے کہا۔ معاف کرنا مجھے پیارے دوست یہ میری سخت غلطی تھی۔

سروج نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا کچھ مضائقہ نہیں سریش۔

سریش نے بیٹھتے ہوئے کہا "آج تم کتنے پریشان ہو"

سروج نے کہا "نہیں نہیں تمہارا خیال غلط ہے"

سریش نے پھر کہا: "ٹھیک ہے اس لئے کہ پُتلا ٹوٹ گیا"

سروج نے کہا: "کچھ نہیں یہ تو ایک کھلونا تھا"

"یہ اسی کا پُتلا ہے۔ جس سے تم محبت کرتے ہو۔ تم اسے فراموش کردو۔ کیونکہ وہ تم کو فراموش کئے ہوئے ہے" سریش نے کہا۔

سروج نے کہا کون۔ میں کسی سے محبت نہیں کرتا"

سریش "مجھے خوب معلوم ہے" (اس نے جیب سے پکچر نکال کر سروج کو دیتے ہوئے کہا) "لو اسے دیکھو" سروج نے پکچر دیکھتے ہوئے کہا۔ سچ بتاؤ۔ سریش (ایک زوردار آواز میں) سریش نے کہا "زیادہ پوچھنے کی ضرورت نہیں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ تم اسے فراموش کردو" سریش جاچکا تھا اور سروج بیٹھا ہوا تھا۔ اور اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "افسوس مجھے علم نہ تھا"

شیلا تم مجھے دھوکہ دوگی، وہ رات کتنی حسین تھی۔ جبکہ تم نے مجھ سے محبت کے عہد و پیمان کئے تھے میں نے سنا تھا کسی کی زبانی مجھے یاد ہے اور خوب یاد ہے محبت اندھی ہوتی ہے۔ شیلا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا میرے ساتھ دھوکہ ہو رہا ہے جس راز کو میں مدتوں سے پوشیدہ کئے تھا آج وہ افشا ہو گیا۔ مجھے امید نہ تھی کہ تم میری امیدوں پر پانی پھیر دوگی۔

دوسرے دن شیلا رات کو سریش سے کہہ رہی تھی۔ مگر وہ مجھے تمہاری محبت کا خیال ہے اور اس کے بھولے پن کا" وہ تم کو کافی عرصہ ہوا فراموش کر چکے تم اب تک ان کی یاد کرتی ہو۔ تم بھی انھیں بھول جاؤ" "میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ مجھے اتنی جلد بھول گئے" سریش نے جواب دیا "شیلا ان باتوں کو چھوڑ دو وہ سپنے تھے" شیلا نے جواب میں کہا "نہیں وہ ضرور مجھے یاد کرتے ہوں گے"

سریش نے کہا کہ "اسی لئے کہ تم ان سے راتوں کو چوری سے ملاقاتیں کیا کرتی تھیں۔ ہاں شیلا سنو میں ایک بات اور بھول گیا۔ سنو پرانا نانا تمہاری ماں مجھے وچن دے چکیں تم جانتی ہو تمہاری شادی مجھ سے ہو گی۔ اور شادی کے دن بہت قریب ہیں"

شیلا نے درد بھرے آواز میں کہا۔ ہاں مجھے معلوم ہے اور آج ہی ماں نے مجھ سے کہا تھا۔ شیلا اپنے غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسکی خوبصورت بنسری سبزہ پر پڑی تھی وہ بنسری اٹھانا بھول گئی۔ شیلا کا خیال تھا کہ وہ دوسرے دن ایک مرتبہ سروج سے پھر ملے۔ وہ اور سریش دونوں

اُٹھ کر ندی کے کنارے سے چند لمحات میں غائب ہو گئے۔

آج ہی کی رات کو شیلا سروج سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ چاندنی راتوں کی طرح یہ بھی وہی رات تھی۔ وہی چاندنی وہی ستارے وہی منظر تھا سروج ندی کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شیلا کی بنسری کو سبزہ پر پایا اور اس کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "شیلا میرے واسطے ایک ہی یادگار چھوڑ گئی"۔ شیلا سروج کے مکان پر گئی۔ لیکن سروج موجود نہ تھا اسے اپنی بنسری کا خیال آیا اور ندی کی جانب روانہ ہوئی ندی کے قریب پہنچتے ہی اس نے ایک نغمہ سُنا جو کہ درد میں بھرا ہوا تھا۔ وہ آواز پہچان گئی یہ سروج ہی تھا۔ قریب پہونچتے ہوئے اس نے کہا۔ سروج سروج!! اُسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ رہے تھے۔ سروج نے اپنا سر اُٹھایا وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اور کہا۔ "کہو شیلا کیا کہنا چاہتی ہو؟ شیلا نے آنکھوں میں اشک بھرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کرنا سروج"۔

اس نے جواب دیا۔ "شیلا تم نے کوئی قصور نہیں کیا"۔

(شیلا نے گردن جھکا لی) ہاں شیلا مجھے معلوم ہے۔ تمھاری شادی کی تمھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں نے سریش کے مُنھ سے سُنا تھا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس سے شادی ہوگی۔ کیا تم بتا سکتی ہو؟ شیلا کی آنکھوں سے دو گوہر نایاب ٹپک پڑے اس نے کہا۔ "سریش سے۔ سریش نے تمھارے متعلق یہ کہا تھا۔ شیلا سروج کو بھول جاؤ وہ تمھیں بھول چکے ہیں اور وہ کسی اور سے محبت کرتے ہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے

ہیں کہ آپ کس سے محبت کرتے ہیں؟"

سروج نے کہا "شیلا میں اس دنیا میں تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا۔ سریش نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔ شیلا کو فراموش کر دو۔ کیونکہ وہ تم کو بھول چکی ہے۔ شیلا میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے ایک دوست ہوتے ہوئے سریش نے مجھے دھوکہ دیا۔ آہ مجھے اس کا علم نہ تھا......" سروج کی آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں! وہ غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔

"انتقام.......... انتقام.......... ضرور میں آج سریش سے انتقام لوں گا۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ جائے" شیلا نے کہا کہ "سخت نادانی ہے یہ تمہاری۔ غصہ بہت بری شے ہے۔ تم اسے معاف کر دو.......

تم اسے معاف کر دو۔ سروج" سروج نے کہا: کیا ایک دوست کا یہی فرض ہے۔ تم ہی بتاؤ نہ شیلا" شیلا نے محبت بھرے الفاظ میں کہا "نہیں تمھیں ضرور معاف کرنا ہوگا" سروج نے جواب دیا اچھا دیوی میں نے اسے معاف کیا" سروج نے کہا اچھا شیلا میں جاتا ہوں ہاں ایک بات یاد آئی "لو یہ تمہاری بنسری" شیلا نے بنسری لیتے ہوئے کہا "شکریہ........ یہ بنسری آپ کو کہاں سے ملی" سروج یہیں سے ملی تھی۔ یہیں کنارے پر پڑی تھی........ "ٹھیک ہے میں بھول گئی تھی" سروج نے کہا اچھا شیلا جاتا ہوں۔ خدا حافظ نمستے" اس نے ایک الوداعی سلام کیا۔

شیلاؔ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے وہ چند قدم چلا ہی تھا کہ کسی نے آواز دی :- سروج "ٹھہرو کہاں جاتے ہو"۔ سروؔج آواز کو سن کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ یہ شیلاؔ کی ماں کی آواز تھی۔ سروؔج شیلا کی ماں کے قریب پہنچا۔ شیلاؔ کی ماں نے کہا۔ اُشیلا کو مخاطب کرتے ہوئے)۔ "شیلاؔ لو یہ ڈائری"! شیلاؔ نے چھوٹی خوبصورت ڈائری لیتے ہوئے پوچھا "کیوں ماں یہ کیسی ڈائری ہے"؟ شیلا کی ماں نے جواب دیا "یہ ڈائری ندی کے کنارے پر پڑی ہوئی تھی اتفاق سے نوکر کا گزر اس طرف سے ہوا۔ اس کی نظر یکایک اس طرف پڑی اور ڈائری اُٹھا کر رکھ لی۔ مکان پر آ کر اس نے یہ ڈائری مجھے دی ...... ڈائری سروج ہی کی ہے"۔ شیلاؔ آج مجھے تمام واقعات معلوم ہو گئے۔ سریش کی چالبازیاں مجھ پر ظاہر ہو گئیں ہیں میں بہت خوش ہوں کہ غلطی کرنے سے بچ گئی۔ ....؟

اور پھر چند روز بعد ایک سہانی رات کو وہ ازدواجی رشتہ میں منسلک کر دئے گئے۔ .... وہ رات کتنی حسین دلکش و دلفریب اور ارمان پرور تھی ....۔

—·—

بیتی ہوئی باتیں

(از عبدالرحمن دہلوی)

موسم گرما گزار کر جب میں شملہ سے بمبئی لوٹا تو میرے نوکر نے دو ڈھائی ماہ کی وہ ڈاک جو بمبئی کے پتہ پر آئی تھی میرے سامنے ناشتہ کے بعد دکھلائی۔ میں نے سگریٹ سلگا کر ایک ایک خط کو پڑھنا شروع کیا۔ میں اپنے پرانے دوست جاوید کے خط کو پڑھ ہی رہا تھا کہ میری نظر ایک لفافہ پر پڑی جس پر لکھا تھا۔

"اس کے نام ________

جو مجھے نہیں جانتا"

میں نے تعجب اور اشتیاق کے ساتھ اس لفافہ کو چاک کیا۔ اسمیں لکھا تھا۔

....

"دل و جان کے مالک۔ میرے لڑکے کا کل انتقال ہوا ہے، یہ میرا اکلوتا لڑکا تھا۔ تین دن اور تین راتیں مجھے جاگتے ہوئے گذر گئی ہیں لڑکے کو انفلوانزا ہوا۔ سخت کرب و بے چینی اور شدید بخار میں تین رات تڑپ تڑپ کر گزاریں میں اس کی لاش کے قریب لکڑی کی تپائی پر بیٹھی ہوں، بچہ نے جس وقت دم توڑا میں موجود تھی اس کی روحانی و جسمانی

اذیت کہو سکرات موت کو اپنی آنکھ سے دیکھا، آہ! کمبخت مجھ بدنصیب کو کیوں نہ آگئی، میری محبت اور تمناؤں کا مرکز ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے میرے سامنے اس وقت یہ لڑکا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے بالکل اس حالت میں جیسے سو رہا ہو، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن سے ذہانت اور لیاقت کا نور جھلکتا تھا۔ اب ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہیں، میں نے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ کر سفید چادر ڈالدی ہے اور قریب کی میز پر بیٹھی یہ خط آپ کو تحریر کر رہی ہوں، دنیا میں اب صرف ایک ہستی ہے جس کا مجھ سے کوئی تعلق باقی رہ گیا ہے ——— وہ آپ ہیں! یہ بات کیسی تعجب انگیز معلوم ہوگی کہ میرا اور آپ کا کوئی تعلق ہو۔ لیکن آپ حیران نہ ہوں میں ابھی بتاتی ہوں۔ آپ غور کر رہے ہوں گے کہ میں تو اس عورت کو جانتا بھی نہیں کہ کون ہے نہ اس خط میں اس کا نام ظاہر ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ مجھے جانتے ہیں خوب جانتے ہیں ——— لیکن بھول گئے! ہاں میں نے میز پر تیز روشنی رکھ چھوڑی ہے۔ کمرہ میں روشنی بڑھ گئی ہے اور مردہ لڑکے کے سفید و سرد چہرہ پر یہ تیز روشنی پڑ رہی ہے۔ اس کے چہرہ کے خط و خال سے اس کی زندگی کے واقعات اور اپنی حیات المیہ کے تمام نقشے ایک فلم کی صورت میں میری ذہنی آنکھ کے پردہ پر حرکت کر رہے ہیں، مجھے خود بھی بخار چڑھ رہا ہے۔ آج کل تمام شہر میں انفلوائنزا کا دور دورہ ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے اور اختلاج بھی ہو رہا ہے، میں اس صدمہ کو یقیناً برداشت نہیں کر سکتی اس خط

کے ختم ہونے پر میری روح ہڈیوں کے پنجرہ کو توڑ کر باہر نکل جائے گی۔
بہت اچھا ہوگا ——— جس قدر منزل قریب آجائے، مسافر کو آرام ملتا ہے، آج میں صرف آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ سب کچھ کہہ دینے پر آمادہ ہوئی ہوں اس وقت تک جس راز کو امانت کی طرح حفاظت سے رکھا تھا، اسے اس شخص کے حوالے کر رہی ہوں۔ جس کا وہ مالک ہے، دنیا میرے راز سے آگاہ نہیں ——— اور آپ آگاہ ہیں لیکن بھول گئے! جس وقت یہ خط پہونچیگا۔ میں ختم ہو چکی ہونگی بہت ممکن ہے اس وقت آپ رنجیدہ خاطر ہوں۔ لیکن میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی آپ کی پشیمانی یا شاید پریشانی میرے لئے کس کام کی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اگر اس موذی حملہ سے بچ گئی تو اس خط کو چاک کر دوں گی اور جس طرح آج تک اس راز کی حفاظت کی ہے۔ اسی طرح یہ راز پھر محفوظ ہو جائیگا میں پھر خاموش زندگی بسر کرنے لگوں گی، اگر زندہ نہ رہی تو یہ خط کسی نہ کسی طرح ڈاک میں ڈال دیا جائے گا۔ جس کا میں نے انتظام کر لیا ہے جس وقت یہ تحریر آپ کے ہاتھ میں پہونچیگی۔ اس وقت میں مر چکی ہونگی۔ اور آپ اس تحریر کو یہ سمجھکر پڑھیں کہ یہ ایک مردہ عورت کی پہلی اور آخری تحریر ہے۔ ادبیت سے دور دلکشی سے معرّا اور شاعری سے خالی مگر دل کی کہانی ہے اور دل کی زبانی ہے۔ اس لئے اس میں واقعیت ہے جسے آپ اپنے ناولوں میں ڈرامی کیفیت کہتے ہیں اس میں جوش ہے۔ سچے

واقعات کا نشہ ہے، پاک الفت کا سوز ہے۔ دلفگاری محبت کا جذبہ ہے غرض
سب کچھ ہے! آپ کو ایک مردہ عورت کی تحریر سے خائف ہونے کی
ضرورت نہیں وہ نہ آپ کی محبت کی طلبگار ہے نہ آپ سے شفقت و توجہ
کی اپیل کرتی ہے نہ کسی تالیف قلبی کی محتاج ——— وہ اس دنیا ہی
میں نہیں ہے۔ یہ تو ایک میری زندگی کا افسانہ ہے اس عورت کی جس کی
زندگی اول سے آخر تک آپ کے لئے وقف رہی۔ وہ آپ کی خاطر سانس
لیتی تھی۔ اور اب جان بھی آپ کے لئے دی ہے، میں آپ سے صرف
ایک چیز کی طالب ہوں۔ وہ یہ کہ آپ اس خط کو پڑھئے اور اس پر یقین
کیجئے، اسے جھوٹ نہ سمجھئے۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک ماں اپنے
لڑکے کی لاش کے پاس بیٹھ کر کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔ بہرحال اسے پڑھئے
اور اسے سچ سمجھئے میں اپنی زندگی کا فلم آپ کو دکھانا چاہتی ہوں۔ پوری
داستان نہیں سناؤں گی۔ گھبرایئے نہیں، یہ وہ زندگی ہے جو صرف اسوقت
سے شروع ہوتی ہے جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا میں اس سے پہلے بھی دنیا
میں تھی۔ لیکن اس عہد کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی۔ میری زندگی درال
اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا اس سے
پہلے میری زندگی کیسے گزر رہی تھی۔ اس کی یاد اب ذہن سے محو ہو چکی ہے
اس لئے بیان نہیں کی جا سکتی۔ نہ اسے یاد کرنے سے کوئی فائدہ ہے۔ پہلی
بار جب میں نے آپ کو دیکھا اس وقت میری عمر کل بارہ برس کی تھی اور آپ
اس مکان میں رہتے تھے۔ جس میں اس وقت میں اسی جگہ جہاں

اس وقت میرا خط —— میری زندگی کی آخری روداد ——
آپ پڑھ رہے ہیں۔ آپ جس بالاخانہ میں رہتے تھے اس کے اوپر کے
زینہ کے عین سامنے کے کمرہ میں ہم لوگ رہا کرتے تھے۔ وہ چھوٹا سا بالاخانہ
جس میں طوطے کا پنجرہ لٹکا رہتا تھا، ہمارا ہی تھا، یعنی میرا اور میری
ماں کا۔ میں اس وقت اس جگہ رہتی تھی، اب کہیں اور رہوں ——
بتانے سے کیا فائدہ!

آپ مجھ کو یقیناً بھول گئے ہوں گے۔ میری ماں کو بھی بھول گئے ہونگے
جن کے ساتھ میں آپ کے کمرہ کے سامنے والے کمرہ میں رہا کرتی تھی۔ شاید
آپ کو یاد آئے کہ اس کمرہ میں ایک فوجی جمعدار کی بیوہ اور اس کی اکلوتی
لڑکی رہا کرتی تھی، اب میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، میں مرتے وقت ایک بچہ
کی ماں تھی، مگر اب یہ بچہ مر چکا ہے۔ اور اب میں بھی مر چکی ہوں، آپ کو
بھلا کیسے یاد آ سکتا ہے؟ کہ میں کون تھی شاید آپ کو میرا نام معلوم نہ ہو
کیونکہ ہمارے کمرہ پر کوئی بورڈ اور نام کی پلیٹ نہ تھی اور نہ ہمارے یہاں
کوئی ملنے جلنے آیا کرتا تھا۔ ہم لوگ بہت خاموش زندگی بسر کرتے تھے
زیادہ باہر نہیں جاتے تھے آپ کو پندرہ سال کی بات بھلا کیسے یاد رہ سکتی
ہے، آپ یقیناً بھول گئے ہوں گے، لیکن مجھے وہ واقعات جو اس طویل
وقفہ کے دوران میں گذرے بخوبی یاد ہیں۔ میں کس طرح بھول سکتی
ہوں! جس وقت سے آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی میں اس وقت سے
اس وقت تک کے واقعات نہایت صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ

بیان کر سکتی ہوں، آپ جس کمرہ میں مقیم ہیں وہاں آپ کے آنے سے پہلے دو میاں بیوی رہتے تھے، بڑے جھگڑالو تھے۔ ہر وقت آپس میں دنگا فضیحتی کرتے رہتے، میاں شرابی تھے اور جب شراب کے نشہ میں چور ہوتے تھے تو بیوی ٹھکیں مارتی تھیں، غرض آئے دن یہی شور وشغب رہتا تھا، اور ہم لوگوں کے لئے خاص طور پر تکلیف کا باعث ہوتا تھا جس وقت ہم نے یہ سنا کہ سامنے والے کمرہ میں ایک مصنف اور شریف آدمی آنے والے ہیں تو ہماری خوشی کی کوئی حد نہ رہی ہم نے سمجھا کہ ہماری مصیبتوں کا اب خاتمہ ہوا اس پاجی پڑوسی کی وجہ سے جو تکلیف اور کوفت ہوتی تھی اب دور ہو جائے گی، آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی بڑا بالاخانہ اور اس کے اردگرد کے چھوٹے کمرے صحن و دروازہ وغیرہ صاف کرائے گئے، اور ایک دن نیچے سڑک پر اسباب کا ایک ٹھیلہ کھڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے اپنے برآمدہ میں کھڑے ہو کر فرنیچر کے اُترنے اور اوپر لے جانے کا تماشہ دیکھا۔ آپکا خاندانی ملازم آپ کے ہمراہ تھا۔ اس نے سامان اُتروایا، کمرہ میں جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں اس سامان کو رکھوایا تصویریں دیواروں پر لگوائیں کھڑکیوں اور جوڑوں پر روغن کرائے غرض تمام گھر چندن کر دیا۔ دوسرے روز آپکی کتابوں کا ٹھیلہ آیا۔ کیا کہوں آپ کی کتابوں کا انبار دیکھ کر دلکو کس قدر مسرت حاصل ہوئی۔ چھوٹی بڑی مجلد اور غیر مجلد کتابوں اور اخباروں اور رسالوں وغیرہ کا ایک ڈھیر تھا! میرے پاس بھی چند کتابیں تھیں چھوٹی چھوٹی چھوٹی اور بے حیثیت کتابیں ہیں جب اپنی ان کتابوں کا آپ

کی کتابوں کے انبار سے مقابلہ کرتی تھی تو دل ہی دل میں خفیف ہوتی تھی، نہ معلوم کیوں؟ آپ جانتے ہیں۔ یہ سب تفصیلات اور جزوی واقعات میں کیوں لکھ رہی ہوں ـــــــ صرف یہ دکھانے کے لئے کہ آپ میری زندگی میں کیوں کر داخل ہوئے، آپ نے میری حیات اور میرے ذہن پر پہلی بار کیسے اثر ڈالا، کیوں کر تسلط قائم کیا، ان حالات نے میری زندگی پر آشارہ کیا اثر کیا، اس کی داستان آگے ہے، جب تک میں نے آپ کو نہیں دیکھا یہ سمجھی تھی کہ آپ ایک بوڑھے آدمی ہوں گے ایک طویل وسفید ڈاڑھی ہوگی، آنکھوں پر عینک ہوگی، لکھنے پڑھنے کی وجہ سے کمر خمیدہ ہوگئی ہوگی غرض کہن سالی اور کمزوری کا اعلان اور نمونہ ہوں گے، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی یہ دیکھ کر کہ سامان آنے کے تیسرے دن آپ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر آئے۔ سب سے پہلے آپ کے ملازم نے اتر کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ اور آپ پچھلی نشست پر سے اُٹھے۔ باہر نکلتے ایک طویل قامت۔ جوان العمر، خوش رو نوجوان ـــــــ اور اتنے نامور اور اتنے بڑے مصنّف، اوائل عمر ہی میں اتنی شہرت و توقیر حاصل کرلی بیسوں ناولوں کے مصنّف اور مشہور افسانہ نویس کا یہ حلیہ دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ آپ نے نہایت تیزی سے زینہ پر قدم رکھا۔ اور پھرتی کے ساتھ چڑھنا شروع کر دیا۔ میں آپ کی اس برق رفتاری، چستی اور جسمانی سج دھج کو دیکھ کر بہت متعجب ہوئی پھر متاثر ہوئی، آپ کی یہ ادا مجھے بہت بھائی اور اب تک آپ کو دل و جان سے چاہتی ہوں، دل و دماغ سے کام

والے کتابوں کے کیڑے۔ مصنف کے لئے کھلاڑیوں کا سا جسم اور جب کہ میری عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہ آسکتی تھی، اور نہ آئی، میں کسی قدر متعجب اور قدرے خوش ہوئی اور اپنے کمرہ میں واپس آگئی اور اس وقت کا انتظار کرنے لگی، آپ دوبارہ باہر نکلیں اور میں دیکھوں، آپ کو دیکھنے کے لئے میری بیقراری ایک معصوم بچّہ کی بیچینی و متجسس طبیعت کا نتیجہ تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور جذبہ کوئی پوشیدہ حس کام نہیں کر رہی تھی۔

آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کو دیکھ کر میری حالت کیا ہوئی تھی میرے جذبات کا کیا عالم ہوتا تھا، ایک لڑکی جو ابھی دنیا کے کسی معاملہ سے آگاہ نہ تھی، ایک شہرۂ آفاق ادیب کو اپنا پڑوسی دیکھ کر کس قدر مسرور و شادمان ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو کبھی مصنفوں کے ہمسایہ بنکر رہے ہیں، میں روزانہ آپ کو آتے جاتے دیکھا کرتی تھی لیکن آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا، اور نہ دیکھنے کی کوئی وجہ تھی۔ میرے برآمدہ سے آپ کے آنے جانے اور آپ کے پاس آنے والے ملاقاتیوں کو پورا اندازہ ہو سکتا تھا، لیکن کوئی شخص مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ میرے مکان کی بناوٹ ہی کچھ ایسی تھی۔ آپ کے پاس زیادہ تر کالجوں کے لڑکے آیا کرتے تھے۔ غل مچاتے۔ گاتے اور آپس میں زور زور سے باتیں کرتے ہوئے زینہ پر چڑھا کرتے تھے۔ آپ ان لڑکوں سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت ایک ادبی تعلیمی ماحول میں رہتے

تھے اکثر اوقات آپ کے پاس نوجوان لڑکیاں آپ کے ناولوں کی شہرت
سن کر آتی تھیں۔ آپ کی تعریف کرنے اور آپ سے میل ملاپ بڑھانے
مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ لڑکیوں کا اور جوان عورتوں کا آپ کے
تصنیفی مشاغل سے کیا تعلق ہے، لیکن اب سمجھ گئی ہوں، اسوقت
مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ آپ کے مداحوں میں عورتیں اور جوان
عورتیں بھی شامل ہیں اور آپ کو عورت سے ملنے جلنے میں کوئی عذر اور
تکلف نہیں ہوتا۔ اس حقیقت سے مجھے ایک اندرونی خوشی بھی ہوتی
تھی کہ کسی نہ کسی دن بھی آپ کے حرم ادب میں باریاب ہوں گی۔ اور
آپ کے ناولوں اور افسانوں کے متعلق میں بھی کسی دن ایک اچھی رائے
آپ کے سامنے پیش کر سکوں گی۔ اس وقت میری عمر صرف بارہ سال
کی تھی جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکی ہوں اور اس لئے میں اس قابل
نہیں ہوئی تھی کہ اس اندرونی جستجو اور لگاؤ کا سبب دریافت کر سکتی جو
مجھ میں آپ کے لئے پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ جستجوئے خاموش
در اصل محبت تھی میں نے آپ کو معصومانہ الفت کی نظروں سے تو پہلے
دن سے دیکھنا شروع کر دیا تھا، میں نے آپ کے قدموں میں دل اس
روز نثار کیا جس روز آپ کسی جگہ سے اپنے گھر کو واپس آرہے تھے اور
میں بالاخانہ کے نیچے پٹری پر کھڑی تھی۔ یاد ہے وہ دن میں اسکول کے
ایک ہمراہی کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی کہ یکایک ایک موٹر آکر رکی
اور آپ اندر سے نکلے تیزی اور چستی کے ساتھ، آپ کی یہ چال مجھے اس وقت

بہت ہی پسند آئی، اب بھی پسند ہے، میرے دل میں فوراً یہ خیال آیا کہ زینہ کا دروازہ آپ کے لئے کھول دوں، اور کسی طرح آپ کی راہ میں آکر جسم سے متصادم ہو جاؤں، شاید اسی طرح ایک دلچسپ تعارف ہو جائے چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور جلدی سے آگے آئی اور زینہ کا دروازہ کھول دیا، اسی اثنا میں آپ بھی آگئے اور میں آپ سے ٹکرا گئی اور آپ نے شکریہ کا لفظ کہکر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر جاتے جاتے میری طرف مدھ بھری نظروں سے دیکھا، ان نظروں میں کیا جادو تھا، کیا قیامت تھی۔ کیا بجلی تھی کہ میرا سارا وجود آپ کے لئے وقف ہو گیا آپ کی یہ نظریں میرے لئے ایک پرحیات آغوش کا کام دے گئیں۔ اور میں بھی خجل ہو کر بلکہ گھبرا کر پیچھے ہٹی، میرا گھبرانا قدرتی تھا۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح آپ سے دوچار ہوئی۔ میرے اسکول کے ہمراہی نے مجھے کسی قدر گھبرایا ہوا دیکھ کر کہا، آپ انھیں دیکھ کر کیوں گھبرا گئیں، یہ کون صاحب ہیں؟ کیا آپ ان سے متاثر ہیں؟ میں نے کسی قدر ترشروئی کے ساتھ ان بیہودہ سوالات کا جواب دیا۔ اور کہا آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں۔ یہ کہہ کر میں اپنے کمرہ میں واپس آگئی اور گھنٹوں آپ کے تصور میں گزار دئے ——— یہ تھی محبت کے پہلے تیر کی خلش۔ میں اُس دن سے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ نے محبت اور چاہت کا لفظ اس سے پہلے بیسوں عورتوں کی زبان سے سنا ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انھیں واقعی طور پر آپ سے الفت بھی ہو، لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جیسی محبت

مجھے ہوئی تھی اور اس وقت تک قائم ہے نہ کبھی ہوئی اور نہ ہوگی نہ آپ سے آج تک کسی نے ایسی محبت کی ہے، میں نے جس ایثار والہانہ عقیدت صبر و رضا اور غلامانہ الفت کے ساتھ آپ کو چاہا ہے۔ اسکی شدت اور عروجی کیفیات سے آپ واقف نہیں۔ کیونکہ آپ نے کبھی کسی عورت سے حقیقی معنوں میں عشق نہیں کیا، ایک لڑکی ایک مشہور مصنف کے لئے اپنے دل میں جو خاموش الفت کی پرورش کرتی ہے اور اس پر جس سرگرمی اور سرجوشی سے قائم رہتی ہے، اس کی مثال بہت کم جگہ ملے گی، میں ایک انجان لڑکی تھی۔ اکیلی اور بے یار و مددگار تھی، میرا کوئی دوست یا میری کوئی سہیلی ایسی نہ تھی جس سے اپنا حال کہہ سکتی۔ مشورہ کر سکتی یا محبت کے باب میں ان سے اچھی بری رائے لے سکتی، میری دنیا بس مجھ تک محدود تھی۔ دوسری عورتیں آپ سے محبت کی دعوے دار تھیں لیکن دراصل وہ آپ سے حقیقی محبت نہیں کرتی تھیں، میں بے لاگ اور بے غرض محبت کرتی تھی، کسی کو اس کا علم نہ خود آپ کو اس کا علم تھا۔ میں خود بھی نہ جانتی تھی کہ آپ کی طرف بڑھنے کا یہ جذبہ پرشوق تجسس و دیدار طلبی سے بڑھ کر اب محبت کی حد تک کیوں پہنچ رہا ہے، میں نے یہ خیال کر کے کہ آپ ایک مصنف ہیں اور کتب بینی کے دلدادہ اپنی کتابیں اور زیادہ شوق سے پڑھنی شروع کر دی۔ باہر کی کتابیں بہت سی پڑھیں غرض ہر وقت پڑھنے لکھنے میں لگی رہتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں مدرسہ میں بہت ذہین مشہور ہو گئی۔ اور یکایک میری لیاقت کا چرچا شروع ہو گیا

میں دل ہی دل میں خوش تھی کہ یہ سب آپکی وجہ سے ہوا ہے، میں اپنی جماعت میں اول آئی، والدہ نے مجھے پیار کیا، استانیوں نے تعریف کی ——— لیکن آپ کو معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کی ایک حقیقی پرستار کس منزل میں جا رہی ہے، اب میں ہر وقت آپ ہی کا خیال کرتی تھی، دن بھر اپنی زندگی کے آئندہ مناظر کی خیالی تصویریں بناتی رہتی تھی، ان میں بے حقیقت عوالوں کے پردے طلسمی تصورات کی رنگ کاریاں اور قیاسی خوبصورتی اگر کاغذ پر منتقل ہوسکتیں تو میں ضرور آپ کو دکھاتی ——— میں نے اس دور الفت میں کیا کیا طفلانہ حرکتیں نہیں کیں! آتے جاتے آپ کے دروازہ کے ہنڈل کو چومتی تھی یہ سمجھ کر کہ آپ اسے چھوتے ہیں، کبھی کبھی اس دروازہ پر آنکھیں ملتی تھی۔ اگر زمین پر کوئی سگریٹ کا پڑا ہوا ٹکڑا ملجاتا تھا تو اُسے اُٹھا کر لے آتی اور چھپا کر رکھ لیتی۔ تنہائی میں گھنٹوں اسے دیکھا کرتی تھی، اور پیار کرتی تھی غرض اس قسم کی سینکڑوں باتیں ہیں جنھیں میں پوری طرح بیان نہیں کرسکتی، میرے والد کا عرصہ ہوا انتقال ہوچکا تھا، والدہ کو ایک چھوٹی سی پنشن ہمارے والد کے زمانہ کی ملتی تھی جس پر ہمارا گزر ہوتا تھا اتفاق سے ہمارے ایک رشتہ دار پوتا میں رہتے تھے جو ایک مالدار آدمی تھے کبھی کبھی اس شہر میں بھی آتے تھے، ایک دن وہ آئے اور ہمارے ہاں ٹھہرے، کئی دن تک رہے، مجھے ان کے آنے کی کوئی خوشی نہ ہوئی نہ انکے جانے کا رنج ہوا۔ کیونکہ آپ کے خیال میں ہر وقت لگی رہتی تھی، اور اسی حال میں مگن تھی۔ خواہ کوئی آئے خواہ کوئی جائے مجھے کوئی سروکار نہ تھا، ایک

ایک دن میری والدہ نے مجھے بلایا اور کہا بیٹی میں تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتی ہوں۔ میں یہ جملہ سن کر کسی قدر پریشان اور خوف زدہ ہوئی کہ شاید اماں کو میری حالت کا علم ہوگیا ہے، وہ میری محبت سے واقف ہوگئی ہیں اور مجھے سخت سست کہیں گی، میں ڈرتے ڈرتے ان کے قریب گئی انھیں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا بیٹی تمھیں نہیں معلوم ہے ہم لوگ غریب آدمی ہیں اس پنشن پر گزارا نہیں ہو سکتا اور مجھے تمھاری شادی کی بھی فکر ہے مگر جب تک مالی حالت اچھی نہ ہو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے یہاں پونا سے جو صاحب آکر رہے تھے، وہ ہمارے عزیز ہیں اور تمھارے والد کے دوست ہیں اور مال دار آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے بنگلہ میں ایک چھوٹا سا حصّہ ہم لوگوں کے لئے آسانی سے دے سکتے ہیں، اور وہاں پر تمھاری تعلیم وغیرہ کا بھی نہایت اعلیٰ انتظام ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس مہینے کے آخر میں یہ شہر چھوڑ دوں، اور پونا (POONA) چلی جاؤں وہاں ہم ایک رشتہ دار کے یہاں رہیں گے، اور بہتر زندگی کا آغاز ہوگا، میں یہ سن کر سناٹے میں آگئی! کیا واقعی مجھے یہ شہر چھوڑنا پڑے گا، وہ پیارا شہر جس میں ہر وقت آپ کے دیدار ہوتے تھے!... جہاں ایک ایک لمحہ میں آپ کے انتظار کی لذت میں کاٹتی تھی، وہ شہر جس کی سڑکوں پر آپ چلتے تھے، پھرتے تھے، اور جو میرے لئے دنیا کی مقدس ترین سرزمین تھی، کیا مجھے ایسا شہر چھوڑنا پڑے گا —— یہ تھے وہ خیالات

جواس میرے ذہن میں پے درپے آئے اور میرا ذہن چکرانے لگا ، میں فوراً سنبھلی
کوئی جواب نہیں دیا ، اور اٹھکر چلی گئی ۔ میری متاثر نظروں سے میری والدہ
نے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ پیدائشی شہر چھوڑنے کا مجھے رنج ہے ــــــــ
لیکن آہ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کے فیصلہ سے میرے دل پر کیا بیتی ،
میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہ تھے ، میں اپنے چھوٹے برآمدے میں
آکر بیٹھ گئی ، اور دونوں ہاتھوں سے چکرانے والے سر کو پکڑ لیا یہ خیال
کہ میں اپنی والدہ کو اسی شہر میں رہنے پر مجبور کردوں بالکل فضول تھا
کیونکہ میری والدہ کے فیصلے بہت کم بدلتے تھے اور میں تو ان فیصلوں
میں کبھی ترمیم کرا ہی نہیں سکتی تھی ، علاوہ ازیں اس شہر میں غربت کی زندگی
بسر کرنے پر اصرار کرنے کے لئے میرے پاس کوئی معقول دلیل نہ تھی جو
انھیں قائل کر سکتی ، بہرحال میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی ، ہاں رات
بھر اپنے دل سے باتیں کرتی رہی اور بہت دیر تک باتیں کرتی رہی
اور روئی ــــــــ مگر آپ کو کیا معلوم ہے ؟ ــــــــ !!
یہ آخری دن تھا ، اور میں نے سوچ لیا تھا کہ آج آپ سے ضرور
ملاقات کروں گی ، خواہ کچھ بھی ہو جائے ۔ آج میری والدہ ایک تماشہ
میں گئی ہوئی تھیں ، مکان پر کوئی نہ تھا ، اس لئے آپ تک پہنچنا میرے
لئے آسان ہو گیا تھا ۔ میں آپ کے دروازہ تک پہنچی جسم پر لرزہ طاری
ہو گیا ، شوق ملاقات خوف رسوائی سے کسی قدر مضطرب تھی میں نے درواز
پر پہونچکر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھنٹی بجائی ۔ جس کے بجنے کی آواز میرے

کانوں میں آرہی تھی۔ اگر آپ اس وقت آجاتے تو میں یہ کہتی کہ مجھے اپنی کنیز بنا کر رکھ لیجئے، مگر مجھے اس شہر سے ہرگز ہرگز نہ جانے دیجئے، ایک نوجوان لڑکی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر آپ بہت حیران ہوتے بلکہ ہنستے لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا دلی مدعا یہ ہی تھا، کہ تمام عمر آپ کے قدموں میں ایک کنیز کی طرح بسر کروں، مگر افسوس کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی، گھنٹی بجتی رہی، آپ باہر کہیں گئے ہوئے تھے، نوکر بھی گھر پہ موجود نہ تھا میں آزردہ ہو کر واپس آئی۔ اور اپنے پلنگ پر لیٹ گئی، چادر اوپر سے ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس وقت میرے دل میں سوائے آپ کے دیکھنے اور آپ کی صورت کو تکنے کے اور کوئی جذبہ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس وقت تک جنسی رغبت ایک ذرہ حقیر کی طرح بھی میرے دل میں پیدا نہ ہوئی تھی، ایک عرصہ بعد تک مجھے اس کا احساس نہ ہوا میں تو صرف آپکی شکل اور آپ سے بات کرنے کی مشتاق و طلبگار تھی، تمام ہولناک رات یوں ہی گذر گئی، اور میں آپ کے انتظار میں لیٹی رہی، ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتی تھی، اتنی دیر میں میری والدہ آگئیں اور آتے ہی سو گئیں، میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور کمرہ سے باہر نکلی اور آپ کے کمرہ کی طرف آئی، سخت سردی نہ تھی مگر جسم اور روح دونوں منجمد ہو جانا چاہتے تھے، میں آئی گھنٹی پھر بجائی مگر آپ کے یہاں سے پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ سوچا اب صبح ہونے میں دو تین گھنٹے ہیں، آپ کے آنے تک اسی ہی جگہ انتظار کروں۔ جہاں آپ کے دروازہ تک راستہ

جاتا تھا، وہاں ایک ٹاٹ بچھا ہوا تھا، میں اس حالت میں وہاں ہی لیٹ گئی، ! ! زینہ میں لیٹنے کا خیال اس وجہ سے بھی آیا کہ جس وقت آپ اندھیرے میں آئیں گے تو ٹھوکر سے مجھے ضرور مس کریں گے، اور اسوقت اُٹھ کر آپ کے قدم چوم لوں گی، میں خوشی میں کانپ رہی تھی، لیکن آپ کو دیکھنے اور آپ کے پیر چھونے کے لیئے میں ہر تکلیف اُٹھا سکتی تھی

آخر کار آپ آئے، صبح صادق کا وقت تھا، میں نے نیچے کا دروازہ کھلنے کی آواز سُنی، آپ اوپر آرہے تھے، سیڑھیوں پر آپ کے پیروں کی آواز آرہی تھی، میں نے چاہا کہ آپ کے قدم چوم لوں لیکن ہمت نہیں ہوئی اندھیرے میں ایک طرف ہٹ گئی، آپ آگے بڑھے اور ہنڈل پر ہاتھ رکھا یکا یک مجھے تاریکی میں سے لیونڈر کی خوشبو اور ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز آئی، میں نے غور سے دیکھا کہ آپ کے ہمراہ کوئی عورت بھی ہے ——— وہ عورت آپ کے ہمراہ اندر چلی گئی، اور باقی رات اور دن کا بیشتر حصہ آپ کے ساتھ گزارا! لیکن میں نے یہ دیکھ کر کہ آپ کسی اور عورت کو بھی التفات کی نظروں سے دیکھتے ہیں، اپنے دل میں ایک ایسا انتقامی جذبہ محسوس کیا کہ جس کی حرارت سے میں رات بھر جلتی رہی اور صبح دس بجے میں نے اپنے بستر سے سر اُٹھایا تو دیکھا کہ تکیہ گرم آنسوؤں سے تر ہے۔

اسی روز ہم لوگ پونا (POONA) روانہ ہوگئے۔ مجھ میں اب طاقت نہیں رہی کہ جانے کی مخالفت کر سکتی۔

میرے لڑکے کا کل شب انتقال ہوا ہے تھوڑی دیر میں لوگ آئیں گے ایک تابوت لائیں گے، اور اسے بند کرکے لیجائیں گے، قبر میں رکھ دینگے قبر پر پھول چڑھائیں گے، اگر میں زندہ ہوئی تو مجھے دلاسا دیں گے طرح طرح کے لفظوں سے میری ڈھارس بندھائیں گے، لیکن لفظ کیا کر سکتے ہیں، الفاظ! الفاظ ——— ہاں صرف الفاظ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے، سب تسلی اور دلاسا دیکر چلے جائیں گے، لیکن اگر میری غیرت زندگی قائم رہی ——— اور خدا نہ کرے وہ رہے ——— تو میں اکیلی اور تن تنہا ہوں گی، انسانوں میں رہ کر تنہائی، مجمع میں رہ کر اکیلا رہنا ایک ایسی تکلیف ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بہر حال، میں جب پونا (POONA) پہنچی، پندرہ سال کی عمر کی تھی، اور سترہ سال کی عمر تک یعنی دو سال وہاں رہی، میرے رشتہ دار واقعی ایک نیک دل آدمی تھے۔ وہ ہماری ہر طرح مدد کرتے لیکن میرا دل کسی تفریح اور کسی خیال اور کسی آرام کی طرف نہیں جاتا تھا میں اس دو سال کے عرصہ میں کبھی سینما نہیں گئی، کسی سیر میں شریک نہیں ہوئی شادی بیاہ کی کسی محفل میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی، ہم عمر لڑکیوں سے ملنا ایک ناممکن بات تھی، میں ہر وقت مغموم اور افسردہ خاطر رہتی تھی، ہر شخص میری اس حالت سے آگاہ ہو گیا تھا، اور ابتدائی مدارات اور تسلی بخش جملے اب سرد مہری و بے پروائی اور خاموش بے تعلقی میں تبدیل ہو گئے تھے، اور میں خوش تھی کہ لوگوں نے مجھے اپنے حال پر

چھوڑ دیا، میں دن بھر آپ کے خیال میں غمگین اور آبدیدہ رہنا پسند کرتی تھی گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی، اور اس دو سال کے عرصہ میں شاید چار پانچ گلیوں سے زیادہ نہیں دیکھیں میرے عزیز کے جوان لڑکے میری طرف محبت کرنے کی تمنا سے دیکھتے تھے، لیکن سوائے مجھے ناراض کرنے کے اور کوئی اثر میری طبیعت پر نہیں چھوڑتے تھے۔ میں ان کو بعض اوقات جھڑک بھی دیتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کے سوا اور کسی کو محبت کی نظر سے دیکھنا ایک ناقابل معافی جرم سمجھتی تھی روزانہ آپ کے تصوّر میں وہ تمام واقعات دہراتی تھی جو اس اثنا میں آپ کے متعلق میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے تھے، آپ کے متعلق جب کسی اخبار یا رسالے میں کوئی بیان یا مضمون پڑھتی تھی تو دل ہی دل میں باغ باغ ہو جاتی تھی، آپ کے تمام ناول کئی کئی دفعہ پڑھے تھے اور اس طرح پڑھے تھے کہ ازبر ہو گئے تھے۔ سوتے ہوئے اگر کوئی مجھ سے کسی ناول کا پلاٹ پوچھتا یا کوئی فقرہ کہکر رک جاتا تو میں اس وقت پورا پیراگراف سنا سکتی تھی، تو اس وقت بھی جب کہ اس بات کو پندرہ سال گزر گئے ہیں صفحہ کے صفحہ سنا سکتی ہوں، یہ دلی تعلق کا نتیجہ تھا، مگر آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ سے محبت کرنے میں کس درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ اور جوان عورت کے دل میں جوان مرد کے متعلق جو رغبت ہوتی ہے، وہ میرے دل میں پیدا ہو رہی تھی اور اس لئے میں نے اب آپ کو ایک نئے زاویہ اور جذبہ خیال سے دیکھنا شروع کیا اور ایسا بلاخیز طوفان جذبات میرے سینہ میں امنڈنا شروع ہوا کہ جو بچپن کے معصومانہ شوق و جستجو کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ —— میں اپنا

سارا جسم آپ کے حوالہ کر دینا چاہتی تھی، اس وقت صرف روح تڑپتی تھی اب جسم نے بھی تڑپنا شروع کر دیا تھا، میری اب صرف ایک تمنا تھی کہ کسی طرح پونا چھوڑ دوں، اور سیدھی بمبئی پہنچ جاؤں، چنانچہ ایک دن میں اچھی طرح انتظامات کر کے روانہ ہو گئی اور بمبئی ------- جا پہنچی، سامان ریلوے کے مسافر خانہ میں رکھا اور ٹرام میں بیٹھکر سیدھی آپ کے مکان کی طرف روانہ ہوئی دور سے آپ کے مکان کی کھڑکی میں سے روشنی نظر آئی یکایک مجھے محسوس ہوا کہ تمام شہر جو اس سے پہلے میرے لئے مردہ تھا، بیدار اور ذی حیات ہو گیا ہے اور تمام دنیا میرے لئے گرم جوشی سے رقص کر رہی ہے میں نے کھڑکی کی روشنی کو اس طرح دیکھا جس طرح ڈوبتا ہوا جہاز روشنی کے مینارے کو دیکھتا ہے میرے اور آپ کے درمیان شیشہ کی ایک دیوار حائل تھی، میں رنگین رات میں کئی گھنٹے سڑک پر کھڑی رہی اور ٹک ٹکی باندھکر آپ کے مکان کو دیکھتی رہی، جب آپ کے ہاں روشنی گل ہوئی تو میں بھی روانہ ہوئی اور اسٹیشن واپس چلی گئی۔

بمبئی میں آکر میں ایک دوکان میں ملازم ہو گئی، رات کو نو بجے دوکان بند ہو جاتی تھی۔ اور میں آپ کے مکان کی طرف جاتی تھی، پٹری پر کھڑی ہوئی گھنٹوں آپ کی کھڑکی کو دیکھا کرتی، کبھی کبھی آپ مکان سے نکلتے ہوئے یا داخل ہوتے ہوئے نظر آتے تھے تو آپ کے دیدار بھی نصیب ہو جاتے تھے آپ سے ملنے کی از حد آرزومند تھی، ایک دن آپکے مکان کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی کہ آپ دور سے آتے دکھائی دئے۔ میرا

ارادہ ہوا کہ بڑھ کر ملاقات کر لوں لیکن ہمت نہ ہوئی، میں ایک بارہ سال کی لڑکی پھر بن گئی۔ اور گھبرا کر ایک طرف چلی گئی، اور اس طرح فرار ہوئی گویا کوئی شخص میرے پیچھے پکڑنے کے لئے آ رہا ہے، میرا معمول ہو گیا تھا کہ روزانہ آپ کو آکر دیکھوں، جس دن آپ نظر نہیں آتے تھے، میری تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ ایک روز آپ ایک عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے نکلے میں ایک عورت کو آپ کے ساتھ اس قدر قریب و ملتفت دیکھ کر سخت پریشان ہوئی، جسم میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی، اور دل میں رقابت کی جلن پیدا ہو گئی، روح کی ہلاکت کو برداشت کر سکتی تھی، لیکن جسم کی سوزش درد کو برداشت کرنا، اندرونی بیکلی کو سنبھالنا میرے بس کا کام نہ رہا، میں نے تہیہ کر لیا کہ آپ کو دیکھنے کے لئے پھر کبھی نہ آؤں گی، اور آپ جیسے بے وفا کو دیکھنے کی کبھی پرواہ نہ کروں گی، دوسرے روز میں نہیں گئی، تیسرے روز میں مجبور ہو گئی، بے قرار ہو گئی، اور پھر اسی جگہ پہنچی جہاں سے سخت سردی اور برف باری بھی مجھے نہیں ہٹا سکتی تھی، دوسرے روز میں کھڑی ہوئی تھی کہ آپ حسب معمول گزرے اور میری طرف دیکھا آپ کی آنکھوں میں کیا جادو تھا کہ میں تھر تھر کانپنے لگی، آپ کی آنکھوں میں ایک عجیب خواب تھا، میں آپ کو دیکھ کر گھبرا گئی، آپ مسکرائے اور میرے قریب سے ہو کر چلے گئے تیسرے دن پھر یہی اتفاق ہوا! لیکن آپ نے مجھے پہچانا نہیں آپ مجھے قطعی بھول گئے تھے، آپ نے مجھے اچھی طرح دیکھا ہی کب تھا، جو ——— میری شکل آپ کو یاد رہتی، چوتھے روز آپ نے مجھے مخاطب کیا اور میں نے

آپ کو جواب دیا، مگر ڈرتے ڈرتے دلی آرزوئیں تڑپ رہی تھیں، اور آج جب شرف ہمکلامی ہوا تو میرا دل خوشی سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ آپ نے کہا کہ میرے ساتھ کسی ریسٹوراں میں چلئے، ہم دونوں ایک ریسٹوراں میں چلے گئے، آپ کو شاید ریسٹوراں یاد نہ ہوگا، لیکن مجھے خوب یاد ہے، وہاں ہم نے کھانا کھایا، جب بہت رات ہوگئی تو آپ نے کہا کہ کیا آپ کو گھر جانے کی جلدی ہے۔ کیا تھوڑا سا وقت گفتگو کے لئے دے سکتی ہیں؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میرا سارا وجود ہمیشہ کے لئے وقف ہونے کو تیار ہے' میں نے فوراً چلنے پر اظہار رضامندی کر دیا، جس سے آپ کسی قدر متعجب ہوئے کیونکہ تجربہ نے آپ کو بتا دیا تھا کہ گھر چلنے کے لئے اگر کسی عورت کو آمادہ کیا جائے تو اس کے لئے مختلف حیلے ہوتے ہیں، جھوٹ بولنا، التجائیں کرنا، بہانے بازی وعدے، سرد آہیں وغیرہ وغیرہ، بازاری سے بازاری اور بدترین عورت بھی ہوگی تو وہ ایک دفعہ انکار ضرور کرے گی، آپ نے میری فوری رضامندی سے سمجھ لیا کہ میں کوئی آبرو باختہ عورت نہیں، بلکہ الھڑ لڑکی ہوں جسے دنیا کے کسی نشیب فراز سے واقفیت نہیں، آپ نے کہا میرے کمرہ پر چلئے وہاں کچھ دیر باتیں کریں گے، میں نے رضامندی ظاہر کی اور آپ مجھے اپنے کمرہ پر لے گئے، میں انکار کیوں کر کر سکتی تھی، عرصہ کی دبی ہوئی تمنائیں، برسوں کی آرزوئیں اور دلی چاہتوں کے بر آنے کا وقت آیا خوف، خوشی اور خود اعتمادی کے جذبات پے در پے میرے سینہ میں پیدا ہو رہے تھے!!

میں اپنی محبت کا راز سینہ میں چھپانے کے لئے مصر تھی، میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ آپ مجھے پہچانیں یا دلی جذبات سے واقف ہوں، نہ معلوم کیوں یہ جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا، اور نہ کیوں اسے آخر وقت تک پرورش کرنے پر آمادہ ہوئی، جس وقت اپنے پرائے زینہ پر قدم رکھا تمام پچھلے واقعات مجھے یاد آ گئے جس وقت آپ کے کمرہ میں قدم رکھا میرا جسم خوشی اور حیرت کے جذبات سے اس طرح مجروح ہوا کہ میرا سر چکرانے لگا، اور کرسی پر بیٹھ گئی، خدا کا شکر ہے کہ آپ نے میری اس حالت کو غور سے نہیں دیکھا ورنہ الفت آشکار ہو جاتی، میں نے وہ رات آپ کے ساتھ گزاری میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ اس رات سے پہلے کسی مرد نے مجھے نہیں چھوا تھا، میرے جسم کو کسی غیر نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا اس کے لئے میں آپ کو دوش نہیں دیتی، کیونکہ میں نے خود اپنے آپ کو سپرد کیا تھا، بغیر کسی ترغیب کے آپ کے ہاتھ میں گئی تھی، دوسرے روز صبح جب میں چلنے لگی تو آپ نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر میری آنکھوں کی طرف دیکھنا شروع کیا، شاید آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے، مگر آپ نے مجھے کبھی اچھی طرح نہیں دیکھا تھا، علاوہ ازیں جوانی اور لباس کی تبدیلی عورت کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے، اس لئے شناخت آسان نہ تھی، میں چپ چاپ کھڑی رہی اس کے بعد آپ نے ایک بلوریں گلدان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "کیا آپ ان پھولوں کو اپنے ہمراہ لیجائینگی" اس گلدان میں چار سفید گلاب رکھے ہوئے تھے، جنکی بھینی بھینی خوشبو مجھے

مست کر رہی تھی، اور رات کا زرین خواب مجھے اور بھی گد گدا رہا تھا، میں نے شکریہ کے ساتھ وہ گلاب لے لئے، دوسری رات ملنے کے لئے پھر مقرر ہوا میں پھر آپ کے ساتھ رہی، تیسری رات کو بھی رہی، اس رات آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی غرض سے بمبئی سے باہر جا رہے ہیں، میں آپ کے سفروں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھی، اس رات سفر کا نام سن کر مجھے سخت اذیت ہوئی، بہرحال آپ نے وعدہ کیا کہ میں خط بھیجتا رہوں گا، مجھے اپنا پتہ دے دیجئے، میں نے اپنا فرضی نام اور ڈاک خانہ کی معرفت پتہ دے دیا، اور آپ نے تیسری رات کے بعد مجھے ایک عرصہ کے لئے بھلا دیا، دوبارہ جب ملاقات ہوئی تو آپ نے مجھے نہیں پہچانا!!!

کل میرے لڑکے کا انتقال ہوا ہے، یہ ہمارا بچہ تھا، یعنی آپ کی اولاد تھی! ——— میں نے کبھی آپ کو اس کی اطلاع نہیں دی کہ آپ کا ایک لڑکا پیدا ہوا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ پر اعتماد نہ کرتے، اور شاید یہ بھی سمجھتے کہ مجھے مالدار آدمی سمجھ کر یہ ایک دوسرے شخص کی اولاد میرے ذمہ ڈال رہی ہے، میں محبت کی یہ توہین کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، اگر آپ کو مجھ پر اعتماد بھی ہوتا تو آپ سے میں مدد لینے اور اس بچہ کی پرورش کے لئے کچھ مالی مدد حاصل کرنے کے لئے آمادہ نہ تھی کیونکہ میں آپ کو اولاد کے جھمیلے میں پھنسانا نہیں چاہتی تھی، نہ دوبارہ آپ کے سامنے جانا چاہتی تھی نہ کسی طرح اپنی الفت کے اس المناک مگر شیریں انجام سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتی تھی، اس لئے میں نے آپ کو

کبھی اس لڑکے کی بابت نہیں لکھا، اگر ہم کو مالی مشکلات پیش آئیں لیکن
میں نے آپ کے آگے دست سوال دراز کرنا، اور اس بچہ کے نام پر بھیک
مانگنا گوارا نہ کیا، اگر میں چاہتی تو اپنا جسم اوروں کے ہاتھ فروخت کر کے
بہت خوش دل زندگی بسر کر سکتی تھی، لیکن جس جسم کو آپ نے چھوا تھا اسکو
کسی دوسرے کے سپرد کرنا میں انتہائی ذلت اور دنیا کا سب سے بڑا گناہ
سمجھتی تھی، اس لیئے میں نے تمام عمر تنگی اور مالی مصائب میں گزاری،
اس جگہ میں اس کی شکایت نہیں کر رہی ہوں، بلکہ ایک واقعہ بتا رہی
ہوں تاکہ راز کا کوئی اہم پہلو آپ کے ملاحظہ سے رہ نہ جائے، آپ نے مجھے
کوئی خط نہیں لکھا، آپ مجھے بھول گئے مگر میں نے آپ کو دل سے نہیں بھلایا
لڑکا آپ کا ہم شکل تھا ہو بہو آپ کی تصویر تھی، رہی آنکھوں کی چمک وہی
لبوں کا قوس زریں وہی مسکراہٹ، اور جب وہ بڑا ہوا تو بہت ہی خوبصورت
معلوم ہوتا تھا، میں بمبئی کے تھیٹروں میں سنیماؤں باغوں بازاروں میں
بارہا آپ کے قریب سے گزرتی تھی، لیکن افسوس کہ مجھے آپ نہیں پہچان
سکتے تھے، کیسی بھول تھی۔ ایک روز ایک جگہ جلسہ تھا، آپ نے مجھے دیکھا
لیکن اس طرح گویا میں ایک اجنبی ہوں، بیشک میں ایک اجنبی تھی آپ کو
دیکھ کر میرے جسم میں لرزہ پیدا ہو گیا، میں قریب آگئی، آپ نے کہا کیا آپ
میرے ساتھ کھانا کھا سکتی ہیں، میں نے کسی قدر جھجک کر ہاں کہدیا، میں نے
دیکھا کہ آپ کی نظروں میں پھر وہی اجنبیت تھی، مگر آہ کس قدر کشش تھی
میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا، آپ مجھے باتوں باتوں میں اپنے گھر لے گئے

ایک زریں شب پھر آپ کے ساتھ گزاری، مگر افسوس کہ آپ نے ابھی تک مجھے نہ پہچانا، آپ نہیں پہچان سکتے تھے، کیونکہ آپ جوان لڑکیوں کو اپنی نگاہوں کی ساحری سے ورغلا کر مکان پر لانے کے اس طرح عادی ہو چکے تھے کہ اب یہ روز کا معمول ہو گیا تھا، اور کسی خاص لڑکی کی شکل یاد رکھنا آپ کے لئے ناممکن ہو گیا تھا، اتفاق کی بات جس دن میں نے آپ کے ساتھ دوبارہ زندگی بسر کی وہ آپ کا پیدائشی دن تھا اور دوسرے روز صبح میں نے دیکھا کہ بلوریں گلدان میں سفید گلاب کے چار پھول رکھے ہوئے ہیں میں انھیں دیکھ کر خاموش ہو گئی، کیونکہ یہ وہی پھول تھے جو میں نے ایک روز قبل آپ کو بھیجے تھے ہمیرا معمول ہو گیا تھا کہ ہر سال آپ کی سالگرہ کے روز چار سفید گلاب کے پھول آپ کو روانہ کرتی تھی، یہ ایک تحفہ ہوتا تھا، لیکن دراصل یہ یادگار تھی میری پہلی رات کی! جس کی صبح کو آپ نے مجھے اپنے پیارے ہاتھوں سے چار سفید گلاب دئے تھے، میں اس ہدیۂ دل کو ہمیشہ ایک خزانہ سمجھتی تھی اور سال کے سال یہ یادگار الفت آپ کو بھیجتی تھی، آج مجھے پھر پھول پیش کئے گئے، اسی اہتمام و مسرت کے ساتھ جس طرح آپ نے مجھے پہلی رات کے بعد دیے تھے میں نے اپنے ہی بھیجے ہوئے پھول دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لئے، میں نے پوچھا یہ پھول کس نے بھیجے ہیں، کوئی عورت بھیجتی ہے، آپ انھیں پہچانئے میرا تحفہ ہے شاید ان کے ذریعہ سے آپ مجھے یاد رکھیں!! اس جملہ سے میرے تن بدن میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی، اور پوچھا گیا آپ اس عورت کو نہیں جانتے جو ہر سال یہ پھول بھیج کر آپ کی سالگرہ کی رونق بڑھاتی ہے، ہیں نہیں

جانتا، وہ عزیز خاتون کون ہے آپ نے جواب دیا، میں نے آپ کو یاد دلانے کی منشا سے کہا، شاید آپ اس کو بھول گئے ہوں، کوئی ایسی عورت جسے آپ جانتے ہیں، لیکن بھول گئے! آپ نے اس جملہ پر مجھے غور سے دیکھا اور میری نظروں نے پکار پکار کر کہا، ہاں! ہاں مجھے پہچانو میں کون ہوں میری محبت کی توہین نہ کرو اپنی عزیز خاتون کو پہچانو! لیکن افسوس کہ آپ کی آنکھوں کی چمک تھوڑی دیر بعد غائب ہوگئی، آپ مجھے پھر بھی نہ پہچان سکے کیسی بھول تھی ہمیں آپ پر کوئی الزام نہیں رکھتی نہ آپ پر کوئی ذمہ داری عائد کرتی ہوں، لیکن آپ کی محبت اور بے دردی کی قائل ہوں، میرے لڑکے کا انتقال ہوگیا ہے، اور اب میرا کوئی باقی نہیں رہا، آپ مجھے دوبارہ کبھی نہیں دیکھینگے آپ نے مجھے نہیں پہچانا، مگر میں آپ کو الزام نہیں دیتی، میں نے محبت کی لیکن غلط طریقہ سے میں نے آپ سے الفت کی الھڑ پن سے، لیکن آپ کی یاد ہمیشہ ستائیگی شاید دوسری دنیا میں بھی آپ کو ستائیگی، میں مر بھی جاؤں گی نہ میرا اصل نام معلوم کر سکیں گے نہ مجھے پہچان سکیں گے۔ میرا ہاتھ بیکار ہوگیا ہے، اب زیادہ نہیں لکھ سکتی جسم میں لرزہ بخار چڑھ رہا ہے، اور عقل جواب دے چکی ہے دل پہلے ہی پاش پاش ہو چکا ہے اب کیا لکھوں مجھے خیال ہے کہ آپ کی اگلی سالگرہ پر کون سفید گلاب بھیجے گا، وہ گلاب جن سے ہر سال آپ کے کمرہ میں معطرت حیات پیدا ہوتی تھی، یہ گلاب میری زندگی کی آخری نشانی تھے میری پہلی اور آخری خواہش ہے کہ پیارے! ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پر چند سفید گلاب اس گلدان میں رکھ دیا کرنا، اور میری روح کو یاد کرنے کے لئے اپنے

خواب گاہ کے کمرہ کو دیکھ لیا کرنا، گلابوں کو نہ بھولنا مجھے بھول جانے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، لیکن گلابوں کی وصیت کو یاد رکھنا ورنہ دوسری دنیا میں بھی میری روح کشتۂ تغافل رہیگی! میں آخر میں پھر اپنی محبت کا یقین دلاتی ہوں؛ ان عنایتوں کی شکر گزار ہوں، جو آپ نے مجھ پر کیں، اس تغافل اور بے خبری اور اجنبیت پر ہمیشہ کے لئے قربان ہوئی ہوں۔ میری محبت کی نذر یہ چند اوراق جو بطریق اعتراف کئے گئے ہیں۔

قبول ہوں! ———— رخصت پیارے!

ناشاد

روپا

میں نے جب خط ختم کیا تو مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی، گھبرا کر میں صحن میں آیا، اور اس طرف نظر ڈالی جہاں میری پیاری اچھی مینا کا پنجرا لٹکا رہتا تھا، میں نے دیکھا کہ کھڑکی کھلی تھی اور مینا آزاد ہو کر اڑ چکی تھی، مجھے ایسا احساس ہوا کہ میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی ہو اور میں اندر ہی اندر زمین میں دھنستے جا رہا ہوں

میں پھر گھبرا کر اندر آیا، اور خط کو اٹھا کر میز کی دراز میں رکھ دیا۔ سر چکرانے لگا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا، میں سوچ رہا تھا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا، دماغ اس قدر تیزی سے گھوم رہا تھا، تین دن میں کہیں نہیں آیا گیا۔ اور اس کے بعد سے ———— میں روز صبح گلاب کے چار سفید پھول گلدان میں لگا دیا کرتا اور دو تین منٹ اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا

اور گلاب کے سفید اور ہلکے سرخ پتیوں پر میرے کچھ آنسو گر کر شبنم کے قطروں کی طرح چمکنے لگتے۔

(ہائے رے رینجر مار ڈالا)

جمشید مرزا کھنڈیرہ رائسین

نوٹ۔ ادبی بلند پایہ افسانوں کے پڑھنے والے اس سچی کہانی میں ممکن ہے ادب کی چاشنی نہ پائیں۔ ان کے ذوق ادب کے لئے ایسی مٹھاس مہیا کرنا میرا مقصد بھی نہیں ہے، البتہ جدید افسانے میں جو ادب شناس نفسی تحلیل و تجزیہ ڈھونڈھتے ہیں ان کو نفسیات انسانی کے بہت سے پہلو اس میں شاید مل جائیں، —— میرے خیال سے خوف اور بدحواسی میں انسان جن غیر شاعرانہ اور غیر ادبی حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے اس کی ایک خفیف سی مزاحیہ جھلک اس کہانی میں ضرور دکھائی دے رہی ہے، ——

کسی گانوں میں ایک تیندوے کو مویشی کے خون کا لپکا پڑ گیا تھا جو مویشی اور ڈھور بچھڑے ملتے اٹھا لیجاتا، اور کسانوں اور دیہاتیوں کا نقصان کرتا حسب معمول ایک مرتبہ تیندوے نے ایک گائے کے بچھڑے کو مار ڈالا، اتفاقاً گانوں کے رینجر صاحب کا اُدھر گذر ہوا، گانوں والوں نے اُن سے فریاد کی کہ —— "صاحب تیندوے نے بگار رکھا ہے"، رینجر صاحب نے جو شکار کے شوقین تھے اگرچہ کسی کھیلے یا درندے کا شکار ابھی تک نہیں کیا تھا تاہم محض شوق میں حکم

دیا گیا اس گائے کو ڈھک دیا جائے، گانوں والوں نے اُسے چھپا دیا ـــــــ اور تھوڑی دیر بعد رینجر صاحب نے گانوں والوں کو بلا کر لکچر دیا کہ ـــــــ

"ہم تمھاری خاطر اس موذی جانور کو ہلاک کئے دیتے ہیں، تم ہمارے کھانے پینے اور سونے کا معقول انتظام کرو اور وہاں ایک مچان بنا دو، ـــــــ

گانوں والوں نے حسب الحکم مچان بنا دیا، اور رینجر صاحب کی مہمان نوازی میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، شام کو رینجر صاحب کے گھر (مہمان خانے) پر پھر سب لوگ جمع ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ "حجور اب چلاں" (چلیں) ہم نے پاچراز پارچہ یا مچان، بنا ڈو (بنا دیا)، ـــــــ"

رینجر صاحب نے گانوں والوں کی امداد کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک خونی درندے کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہی مقابلہ کے خیال سے انھیں کچھ پھریری سی آرہی تھی، ـــــــ

جیسے جیسے اس مہم کا وقت قریب آرہا تھا ویسے ہی ویسے فارسٹ کے ناخدا رینجر صاحب کے ہاتھ پانوں پھولتے جا رہے تھے، انھیں یکے بعد دیگرے بیسیوں شکاریوں کے قصے یاد آرہے تھے جن کو اس قسم کے موذی جانوروں نے یا تو ہلاک کر دیا تھا یا مجروح کر کے بہت تکلیف پہنچائی تھی، لیکن سوال اس وقت صرف غور و فکر اور احتیاط اور خود حفاظتی کا نہ تھا بلکہ گانوں کے ان "گنواروں" کے سامنے وقار اور اپنی برتری ثابت کرنے کا خیال سب سے اہم سوال تھا، رینجر صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ "ہرچہ بادا باد" مقابلہ کیا جائیگا۔

جب گانوں والوں کی آواز "دعوتِ شکار" کے طور پر سنائی دی تو رینجر صاحب بلاارادہ یہ شعر گنگنا رہے تھے:

درین دریائے بے پایاں درین طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

رینجر صاحب "بسم اللہ" اور "چاروں قل" پڑھتے ہوئے گھر سے نکلے سب کاشتکار کورنش بجالائے اور بے انتہا غلامانہ نیازمندی سے عرضِ مطلب زبان پر لائے ـــــــ نتیجہ کو پس پشت ڈال کر انتہائے جرأت و بہادری سے رینجر صاحب ان کے ساتھ ہو گئے ـــــــ آدھا راستہ پارچہ (رچپان) تک پہونچنے کا طے ہو چکا تھا کہ کسی نے رینجر صاحب کو یاد دلایا کہ ـــــ حجور (حضور) بندوک (بندوق) بھول آئیں (آئے ہیں)، چاروناچار واپس لوٹنا پڑا۔ اور گھر میں آکر بندوق اٹھانے سے پہلے انھوں نے دو رکعت نماز نفل ادا کرنے کے بعد نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ خدا سے یہ دعا کی کہ ـــــــ "الٰہی! ایسے نازک وقت میں مجھے استقلال عطا فرما اور ہمت و جرأت کی ایسی دولت عنایت کر کہ آج کی مہم میں کامیاب ہو جاؤں اور اس کارنامے پر میرے خاندان کی پشتہا پشت فخر کرتی رہے[1] ـــــــ"

رینجر صاحب کی امداد و اعانت کے لئے اُن کے ایک وفادار ماتحت نالے دار صاحب جنگل نے بھی اپنی خدمات گانوں والوں کی بھلائی کے اس کارِ خیر کے لئے

---

[1] یہ دعا مانگنے کا واقعہ بالکل سچا ہے۔

پیش فرمادیں جنھیں بصد شکریہ قبول کیا گیا ــــ "ایک سے دو بھلے" یہ خیال رینجر صاحب کو آیا کیونکہ دیہات کے "گنواروں میں بھلا جرأت و بہادری کا کیا کام"۔ ــــ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ افسر صاحب زیادہ باہمت، جوان سالی اولوالعزم اور جری تھے، یا ماتحت نا کے دار صاحب ــــ لیکن اس بات کے متعلق بہر حال یقین کر لیا گیا تھا، کہ دونوں کی فطری شجاعت یکساں ہوگی گانوں والوں کا یہی خیال تھا ــــ دونوں تھے بھی تو ــــ "بن باسی" جنگل کے افسر، شاید احتیاط، اور حفاظت جان کے اہم مسئلے پر دونوں یکساں سوچتے ہوں گے - ایک نے دوسرے کو مبارکباد دی اور یقین ظاہر کیا کہ "اب بیٹا بچ کر کہاں جائے گا"، ــــ

مچان کے سامنے تیندوا خطرے سے بے خبر اپنے گارے (مارے ہوئے شکار پر بے دھڑک آیا ــــ رینجر صاحب سر شام ہی اس موذی کو دیکھ کر سناٹے میں آگئے، لیکن اُن کے کمال فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا، کہ اگرچہ انھوں نے دونوں آنکھیں بند کر کے بندوق چلائی مگر تیندوا زخمی ہو گیا ممکن ہے یہ غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہو، (تیندوے کی غلط فہمی نہ سمجھی جائے ویسے تیندوے کی غلط فہمی کو بھی دخل ہو سکتا ہے) یا ممکن ہے عجلت یا تجربے کی خاطر لیکن واقعہ یہ ہے کہ رینجر صاحب نے گولی کے کارتوس کے بجائے چار نمبر چھرے کا کارتوس تیندوے جیسے خونخوار درندے پر چلا مارا تھا ــــ

۱؎ یہ اشارہ تیندوے کی طرف ہے۔

زخمی درندہ قریب کی جھاڑی میں چھپ گیا، اور رینجر صاحب دل میں "آئی بلا کو ٹال تو" پڑھتے۔ اور بظاہر ایک پروقار اور پا تمکنت انداز کے ساتھ یہ کہتے واپس ہوئے کہ "سویرے اس موذی کو ڈھونڈھ کر ٹھکانے لگا دیا جائے گا" ———

گھر پہونچنے کے بعد رات بھر رینجر صاحب جاگتے رہے۔ ان کے جذبات کچھ متضاد تھے، درندے پر بندوق چلانے کا یہ پہلا تجربہ بہت ہی دلچسپ تھا مگر اتنا ہی خوفناک بھی ——— آرام دہ بستر پر لیٹنے اور پرتکلف دعوت میں نفیس اور مرغن غذائیں کھانے کے بعد خوف نے یا گھبراہٹ نے تھوڑا بہت پیچھا چھوڑ دیا تھا لیکن اُس موذی کی خوفناک آنکھیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اب بھی نظر آجاتی تھیں ———

البتہ یہ خیال بہت تسلی بخش تھا کہ اُن کا نشانہ خطا نہیں گیا، شاید انھیں اب تک نہیں معلوم تھا کہ وہ گولی نہ چلا سکے تھے، وہ یہ سوچ سوچ کر بھی خدا کا شکر ادا کرتے رہے تھے کہ اگرچہ بندوق چلاتے وقت اُن کے حواس بجا نہیں تھے، اور اُن کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں، پھر بھی "اس پروردگار نے گاؤں والے گنواروں کے سامنے آبرو رکھ لی"

دوسری صبح بڑی دھوم دھام کی صبح تھی۔ ہر طرف گاؤں میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ بچے، جوان لڑکے حتی کہ لڑکیاں تک پٹیل کے برآمدے میں رینجر صاحب کا دیدار کرنے کے لئے بے چین نظر آتے تھے کیونکہ وہ ہیرو تھے، انھوں نے

گانوں والوں کو اس طوفانی دشمن سے جو اُن کے مال و متاع کا دشمن تھا بچانے کا بیڑا اٹھایا تھا، اور اُسے اپنے کئے کی آدھی سزا زخمی کر کے دے چکے تھے، اور اب بھی اُن کا عزم یہی تھا کہ علاقے کو وہ اس وبا سے بالکل پاک صاف کر دینگے۔

نو، دس بجے کے قریب رینجر صاحب کے مہمان خانے کے سامنے گانوں کے ہر گوشے سے مویشی اکٹھا ہونے شروع ہوئے، اس اجتماع مواشی کا مقصد یہ تھا کہ زخمی شکار ان کی مدد سے ڈھونڈا جائے گا، رینجر صاحب کے لئے یہ خیال انتہائی اطمینان بخش تھا کہ وہ مویشی کے گلے کے بیچ میں یا بالکل اُس کے پیچھے رہیں گے تاکہ زخمی درندہ حملہ آور ہو تو اُن سے اور انسانوں کے بجائے ڈھور اور مویشی اُس کے غصے اور انتقام کا شکار ہوں، ——

بڑے تزک و احتشام کے ساتھ مویشیوں کا یہ جلوس روانہ ہوا۔ جس کے لیڈر رینجر صاحب اور ڈپٹی لیڈر نا کے دار تھے —— کل شام کی طرح رینجر صاحب کے قدموں میں آج نہ لغزش تھی نہ چہرے پر خوف و بدحواسی کے آثار —— وہ اپنے جلو میں آنے والے کسانوں سے بہت ہنس ہنس کر ہر موضوع پر گفتگو کر رہے تھے —— اور زخمی تیندوے سے لیکر بھوپال کے رعیت واری نظام تک —— اور رعیت واری نظام بندوبست سے لیکر یورپ کی سیاست اور جرمنی و جاپان کی قوتوں کے تناسب تک —— اور محوری اور اتحادیوں کو فتح و شکست کے یکساں مواقع حاصل ہونے کے موضوع تک —— اپنے خیالات سے رواں دواں جلوس کے حاضرین کو (وا شتر کارنو جس میں ممکن ہے مویشی بھی شامل ہوں) مستفید فرما رہے تھے ——

البتہ ایک بوڑھے سے خرانٹ گونڈ نے جو جلوس کے ہمراہ تھا اور جو اپنی جوانی میں عالی جاہ ریاست کے ولیعہد صاحب بہادر مرحوم کا شکاری رہ چکا تھا یہ بات ضرور مارک کی تھی کہ رینجر صاحب یا تو مویشی کے گلے کے بالکل وسط میں چلتے ہیں یا پیچھے ——— اور اچیا نا ڈھوروں سے تعلق منقطع ہو جانیکی صورت میں بھی وہ انسان صورت مویشیوں " رہا گنواروں " کو اپنے گرد و پیش رکھتے ہیں

مویشیوں کا گلہ آگے نکل چکا تھا۔ رینجر صاحب، ناکہ دار صاحب، اور پٹواری اس سے بہت پیچھے تھے، ——— ناگہاں داہنی جانب کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے سے ایک غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ رینجر صاحب اور اُن کے شہری ساتھیوں کے کان کھڑے ہوگئے ——— اور چشم زدن میں زخمی تیندوا ان عجیب الوضع انسانوں کی جانب حملہ کی غرض سے دوڑا چلا آرہا تھا شاید اُس نے بھی یہ سمجھ لیا تھا کہ غیر جنس صورتیں ہی اُس کی دشمن ہیں، اور وہ انتقام کے لئے پوری پوری طرح تیار ہو کر حملہ آور ہو رہا تھا، ———

——— بلائے ناگہانی سے کون نہیں گھبرا جاتا، ——— کون کہہ سکتا ہے کہ تیندوا بلائے ناگہانی سے کم تھا، جب حقیقت یہ تھی تو رینجر صاحب کو بدحواسی اور بزدلی اور اوسان خطا ہو جانے کا الزام دینے والا وہ شکاری گونڈ کبھی سچا اور ایمان دار کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا، ———

یہ دوسری بات ہے کہ عجلت میں رینجر صاحب نے اپنی بندوق اور جوتے چھوڑ دئے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

کہتے ہیں کہ درندے یا درندہ صفت کی یہ خصلت ہوتی ہے کہ جو دبے اُس کو اور دباؤ ———— تیندوا بھی اسی اصولِ زندگانی کا قائل ہو گا۔ شاید اسی لئے اس نے رینجر صاحب کا تعاقب شروع کر دیا ————

آگے آگے رینجر صاحب بے تحاشا بھاگ رہے تھے اُن کے پیچھے تیندوا اور تیندوے کے پیچھے ناکہ دار بھاگے چلے جا رہے تھے، یہ دو آدمی اور ایک تیندوے کی "گھڑ دوڑ" کچھ اتنی دلچسپ بن گئی تھی کہ گانوں والوں نے بجائے تیندوے کو دوڑانے اور دھمکانے اور عزت دار آدمی پر حملہ آور ہونے کے سلسلے میں سزا دینے کا خیال ترک کر دیا تھا، اور ہر آدمی اپنی جگہ پر محض تماشائی کی حیثیت سے کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ دیکھنا چاہیے اس "ریس" میں کون بازی لیجاتا ہے۔

حسنِ اتفاق سے رینجر صاحب جس سمت میں بھاگ رہے تھے وہ گانوں ہی کی سمت تھی، تیندوے کو جوش انتقام میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اُس کم بخت نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس بوڑھے شکاری گونڈ نے رینجر صاحب کی بندوق اور جوتوں پر اور کارتوسوں کے ڈبے پر قبضہ کر لیا تھا، اور اب وہ باطمینان جوتے پہنے بندوق کاندھے پر رکھے اور کارتوس کا ڈبہ ہاتھ میں لئے خراماں خراماں گانوں کی طرف چلا آ رہا تھا، ————

اس دوڑ میں رینجر صاحب نے اپنا یہ کمال ثابت کر دکھایا کہ وہ دوڑ بھی کسی سے حتیٰ کہ تیندوے سے بھی ہار نہیں سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بڑا کمال ناکے دار صاحب کا تھا جنھوں نے نمک حلالی اور رفاقت کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ برابر تیندوے کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے تھے، حالانکہ جگہ جگہ

انھیں یہ مواقع حاصل رہے کہ وہ رک جائیں، ٹھہر جائیں، مڑ جائیں، چھپ جائیں لیکن انھیں دیکھ کر ہر جاہل سے جاہل آدمی بھی یہ مصرعہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا کہ ع

وفاداری بشرطِ استواری

اس وقت رینجر، تینددوے، اور ناکے دار، ایک جانور اور دو جانور کے حریف انسانوں کی دوڑ کا نقشہ یہ تھا،



سچ پوچھئے تو ناکہ دار تیندوے کا پیچھا اس لئے نہیں کر رہا تھا کہ وہ کوئی بڑا مافوق العادت انسان یا مافوق الرینجر ناکے دار تھا، یا وہ اپنے افسر رینجر کی مدد کرنا چاہتا تھا، ایسا گمان ہوتا ہے کہ گھبراہٹ یا بدحواسی یا خوف کی وجہ سے جدھر رینجر کو بھاگتے ہوئے دیکھا، ناکے دار نے بھی بلا لحاظ اس کے کہ اس طرح تیندوے کا پیچھا ہو جائے گا۔ اس نے بھی بھاگنا شروع کر دیا —— وہ برابر بھاگ رہا تھا اور چلاتا جا رہا تھا، "ہائے رے کھا ڈالا! ہائے رے رینجر مار ڈالا! ہائے رے مار ڈالا"

رینجر صاحب کی تیز رفتاری اور سبک روی میں شبہہ نہ تھا، تیندوا اُن سے ریس نہ جیت سکا اور وہ گاؤں میں داخل ہو گئے، جہاں پہنچ کر وہ جلد ہی جو مکان سامنے آیا گھس گئے اور اُسے اپنی پناہ گاہ بنا لیا۔ دروازہ بند دیکھ کر تیندوا

پلٹا۔ اُسے خود پر اس لئے بہت غصہ تھا کہ شکار کا میل آدھے میل پیچھا بھی کیا اور وہ ہاتھ بھی نہ لگا۔ انتقام ادھورا رہ جانے کی وجہ سے درندہ بہت جھنجھلا گیا تھا۔ لیکن پلٹتے ہی اس نے کیا دیکھا کہ ایک انسان اس کی طرف خود دوڑ کر حملہ آور ہوا چاہتا ہے، ناکہ دار کی یہ حرکت بدمزاج، خفیف اور زخمی تیندوے کو زیادہ مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھی، غصے سے دم پٹک کر وہ سیدھا ناکے دار کی طرف لپکا۔ اب ناکے دار صاحب کو بھی ہوش آیا کہ میں تو خود بخود موت کے مُنھ میں چلا جا رہا ہوں۔ سٹی گم ہو گئی ——— کچھ سوچے بغیر وہ حیران حیران تیندوے کو دیکھنے لگے۔ فیصلہ کرنے سے پہلے دشمن نے آلیا۔ اب کیا تھا۔ جانور اور انسان میں جسمانی کشمکش شروع ہو گئی، تیندوا اتگڑا پڑا۔ ناکے دار کی خوب دُرگت بنائی گئی۔ اُن کے نہ صرف سب کپڑے پھٹ گئے بلکہ ہاتھ بھی بے طرح زخمی کر دیا گیا۔ رینجر کو اسٹیج سے غائب دیکھ کر تماش بینوں کا احساس بھی بیدار ہو چکا ہوگا۔ چیخ چلاہٹ شروع ہو گئی تھی، اس غل غپاڑہ اور ہنگامے کی وجہ سے چھوٹ کر ناکہ دار ایک طرف اور تیندوا ایک طرف بھاگے، ناکہ دار صاحب آبادی کی طرف بھاگ رہے تھے لیکن گھبراہٹ میں دوسرے راستے سے تیندوے نے بھی گانوں کا ہی رُخ کر لیا تھا ———

ناکہ دار تیندوے سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی برابر بھاگے چلے جا رہے تھے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اُن کے مُنھ سے بے اختیار "ہائے ہائے رینجر مار ڈالا" کا نعرہ نکلتا تھا۔ اور بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے ہوئے وہ بھاگ رہے تھے، زخمی ہاتھ

کے خون سے کپڑے لت پت اور غضب یہ ہوا کہ اتفاقاً منھ پر زخمی ہاتھ پھر جانے سے ناکے دار صاحب کی داڑھی جو سفید اور کالے بالوں کی آمیزش سے کھچڑی رنگ کی نظر آتی تھی، اب بالکل سرخ و سیاہ خون میں رنگی دکھائی دے رہی تھی اور چہرے پر خون کا رنگ ایسا بدل چکا تھا کہ گویا کسی نے "وکیوی ڈارک ٹین" پالش بدتمیزی سے کہیں لگا یا ہے، کہیں چھوڑ دیا ہے۔ اُن کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر گانوں کے کچھ لوگوں نے پہچانا بعض نے بالکل نہیں پہچانا لیکن سب کے سب ہی قریب سے اس دیوانہ صفت آدمی کو دیکھ رہے تھے۔ ناکہ دار اپنے حال سے بالکل غافل، سامنے ہی ایک کاشتکار کے مویشی خانے میں گھس گئے، جہاں کچھ بچھڑے اور گائیں اب تک بندھی ہوئی تھیں، —— یہاں پہنچکر انہیں یہ اطمینان محسوس ہوا کہ اب وہ تیندوے کے زد سے اور اُس بڑے خطرے سے باہر ہیں۔

اتفاقات عجیب ہوتے ہیں —— یہ اتفاق بھی اسی لئے عجیب ترین کہا جا سکتا ہے کہ —— قضا کا مارا تیندوا بھی بھاگتے بھاگتے دوسرے راستے سے جب گانوں میں داخل ہوا تو اسی مویشی خانہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا اور پہلے سے اس میں موجود تھا، بعض لوگوں نے ناکے دار کو بے تحاشا مویشی خانے میں گھسنے پر خبردار بھی کیا تھا کہ اندر مت جانا تیندوا ہے، لیکن خوف اور بدحواسی میں اچھے بھلے لوگ گونگے بہرے بن جاتے ہیں۔ تیندوا اندر پہونچکر ایک کونے میں بیٹھا تھا بلکہ زخموں کی تکلیف سے نیم بیہوش پڑا تھا، اسے ناکہ دار کے اندر داخل ہونے کی کوئی خبر نہ ہوئی ——

اب ناکہ دار ایک کونے میں بیٹھے درد کی اور زخم کی تکلیف سے کراہ رہے تھے، تیندوا دوسرے کونے میں نیم مدہوش خاموش پڑا تھا لیکن دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا، تھوڑی دیر کے بعد جب درندے کے حواس ٹھکانے ہوئے اور گرد و پیش کی چیزوں کو اس نے پہچانا اُدھر باہر کے مجمع کا شور و غل سنا اور اپنے آپ کو ایک حصار میں دیکھا تو شاید اُس کی سمجھ میں یہ آیا کہ میں مقید کر دیا گیا ہوں، اس غصّے کو وہ سوائے نامعقول جھپٹوں کے اور کس پر اُتار سکتا تھا، پہلے وہ غرّایا (جس سے ناکہ دار کو صرف یہ خیال ہو سکا کہ کوئی بلاّ یا بلّی ہے پھر یکایک سامنے والے دو جھپٹوں پر حملہ آور ہوا۔ اور انھیں زمین پر پچھاڑ دیا۔ اب تو ناکے دار کے وہ اوسان جو بڑی مشکل سے مجتمع ہو سکے تھے خطا ہو گئے۔ آخر کونسا بہادر ایسا ہو گا جو ایسے نازک وقت میں قضا کو سر پر سوار دیکھ کر ہوش بجا رکھ سکتا ہو۔؟

اتفاق یہ بھی ہوا کہ برابر والے ہی جھونپڑے میں ننگے پانوں، پریشان حال رینجر صاحب روپوش تھے اور روزنِ دیوار سے سینما کے پردے کی طرح گزرنے والے اس سانحے کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے زبان و دل ہم آہنگ تھے، اور وہ اگر کچھ سوچ رہے تھے تو صرف یہ کہ "جان ہے تو جہان ہے"

مگر تیندوے کو دیکھ کر ناکے دار پر جو گذری قلم اس کے بیان کرنے سے قاصر ہے! اُن کی طرف یہ آواز سنائی دے رہی تھی کہ "ہائے رے رینجر

مار ڈالا! ہائے رے کھا لیا! باقی جوان پر گندری ہو اور اُنکی جو حرکات و سکنات ہوں اُنھیں سوائے اُن کے سینیر رفیقِ مہم رینجر صاحب کے اور کوئی نہ دیکھ سکا تھا ——— بہرکیف وہ زیادہ دیر اندر نہ ٹھیرے لیکن انھوں نے باہر کی بھیڑ بھاڑ کا بھی ذرا نوٹس نہیں لیا ان کی زبان پر اپنا انقلابی نعرہ "ہائے رے رینجر مار ڈالا! ہائے آج تو کھلوا دیا" جاری تھا ——— بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہ خدا جانے کدھر بھاگنے کا ارادہ کر رہے تھے ———

لیکن اس تماشے کا ڈراپ سین قریب ہی تھا، پُرانا شکاری گونڈا پہنچا تھا، رینجر صاحب کی پھینکی ہوئی بندوق اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے لپک کر ناکہ دار کا ہاتھ پکڑ لیا اور جھٹکا دیکر کہا "ارے شہر کے بہادر اکسے مار ڈالا رینجر نے؟ کون کھا گیا تجھ کو؟ آیا وہاں سے کہیں کا وہ!" اس کے سوا بھی بوڑھے شکاری .... (جسے رینجر اور ناکہ دار ہمیشہ گالیوں سے مخاطب کرتے تھے) دونوں سے عمر بھر کا بدلہ انھیں خوفناک لمحوں میں لے لینا چاہتا تھا۔

اس سے آگے کے واقعات کچھ زیادہ اہم نہیں۔ شکاری گونڈے نے بڑی آسانی سے تیندوے کو صرف ایک فائر چلا کر ہلاک کر دیا۔ جب رینجر صاحب اور ناکہ دار اور سب گانوں والے جمع ہوئے ——— تو رینجر صاحب نے شکاری گونڈ کو "بوڑھے پاگل" کا خطاب مرحمت فرمایا کیونکہ اس نے بھاگ کر جان بچانے کے بجائے بندوق پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو زبردست جانی خطرے میں ڈال دیا تھا ——— گانوں والوں نے افسر جنگل کی پوری پوری تائید کی

لیکن جب رینجر اس مہم کی کامیابی کے بعد واپس چلے گئے تو یہ واقعہ دور و نزدیک کے علاقے میں خوب مشہور ہوا - اور اسی طرح مشہور ہوا جس طرح کہ یہاں لکھا گیا ہے۔ شدہ شدہ اس کی یہ تفصیلات کسی نہ کسی طرح رینجر صاحب کے کان میں بھی پڑیں -

اور اب وہ کبھی بھول کر بھی اس علاقے کے جنگل کا دورہ کرنے کے لئے نہیں جاتے، وہاں کے باشندے نہ صرف لپکے ہوئے تیندوے کی وبا سے آزاد ہیں، بلکہ اب یہ اُنکا حق ہے کہ رینجر اور ناکہ دار کی جانب سے بے پرواہ ہو کر جنگل سے جائز و ناجائز جس طرح چاہیں فائدہ اُٹھائیں ——

سرگذشت

مختصر افسانہ

(از عشرت بخاری)

یہ جو سامنے مکان نظر آرہا ہے اک فردوس محبت ہے جہاں دو پاک فرشتے رہتے ہیں جو سراپا محبّت اور مجسم خلوص ہیں، اس مکان کے ارد گرد شب و روز سعادتمندی طواف کرتی رہتی ہے - مکر و فریب اور تصنع اُسکے نزدیک تک نہیں پھٹکتے - گو یہ مکان زر و مال سے خالی ہے، مگر محبّت کی دولت نایاب سے معمور، اس مکان کے رہنے والوں کے بے لوث جذبات

اور بے غرض محبت نے اسے خلوص اور پاکیزہ محبت کی عبادت گاہ بنادیا ہے جن کے دل حقیقی محبت کے نور سے روشن ہیں، اور چہرے گہری الفت کے آئینہ دار ہیں، اس گھر کی مالکہ ایک حور شمائل حسینہ ہے جو سراپا جمال ہے اور جس کی روح یکسر لطافت اور شیرینی، مگر سماج کی نظروں میں وہ باغی بدچلن اور بدکار ہے، میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ کیا ایسا حسین وجمیل چہرہ بدکاری اور گنہگاری کی آلائشوں کا پردہ دار ہو سکتا ہے، کل جب میں اُس کے پاس گئی تو باتوں باتوں میں اُس سے پوچھ بیٹھی کہ دنیا والے اُسے بدچلن اور بدکار کیوں کہتے ہیں، میرے ان الفاظ پر وہ تلملا اٹھی۔ میں نے دل میں کہا کہ خوامخواہ کیوں پوچھا۔ کیونکہ میرے پوچھتے ہی وہ ایک مجروح ہرنی کی طرح تڑپ اُٹھی، وہ زبان خاموشی سے کہہ رہی تھی۔

دل پہ کسی نے تیر وہ مارا کہ ہائے ہائے

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "تم پوچھ کر کیا کروگی؟ دنیا والے تو ظاہری صورتوں پر جاتے ہیں، وہ حقیقت تک پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ گنبد کی طرح بے سوچے سمجھے آواز کو لوٹانا جانتے ہیں، مجھے دنیا والے ایسا کیوں تصور کرتے ہیں، یہ لمبی داستان ہے طویل سرگزشت!"

"کتنی طویل سرگزشت کیوں نہ ہو سن کر ہی میرے دل کو سکون حاصل ہوگا، بشرطیکہ تمھیں اس کے سنانے میں روحانی کوفت نہ ہو"

"نہیں مجھے تو سماج۔ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی خامیاں بے نقاب کرنے میں مسرت حاصل ہوتی ہے"

میں بھی ایسے خاندان میں پیدا ہوئی اُس نے اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، جس کے افراد سماج اور پرانے روش کی کورانہ تقلید کے حامی تھے۔ میری کم سنی میں ہی خاندان کے چند افراد نے میرے مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔ جب میں نے زندگی کی اٹھارھویں سیڑھی پر قدم رکھا تو میری شادی ہوگئی، آخر مجھے اپنے والدین رشتہ داروں ہمجولیوں اور وطن کو چھوڑنا پڑا سسرال پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ میری شادی ایک چالیس سالہ بوڑھے سے کر دی گئی ہے۔ کیا میرے والدین کو مجھ سے محبت نہ تھی؟ میں کہوں گی نہیں تھی۔ اُنھیں مجھ سے نہیں دولت سے محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے میرے شباب کو قربانگاہِ دولت پر نثار کر دیا۔ مجھے ایک کثیر رقم میں اس بوڑھے کھوسٹ کے ہاتھ بیچ دیا۔ میرا شوہر ایک دولت مند سوداگر تھا۔ مجھے ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ بیش قیمت زیورات اور عیش و عشرت کے سامان مہیّا تھے۔ مگر میری روح ایک بڑی کمی محسوس کر رہی تھی۔

گھٹے ہوئے جذبات کی گرمی میرے جسم کو شمع کی طرح پگھلا رہی تھی میرا دولت مند شوہر شب و روز دولت جمع کرنے میں لگا رہتا اُسے صرف سونے چاندی سے محبت تھی۔ میں ایک زر خرید غلام کی طرح اُس کے ٹکڑوں پر پیٹ پال رہی تھی اور جبراً اس کی ہوس رانیوں کا شکار ہوتی یہ خداوندان زر و مال اپنی بیویوں کو اپنے نفس کی تشنہ آرزوؤں کو سیراب کرنے کا آلہ سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے جسموں سے شادی کرتے ہیں۔ انھیں

اُن کی روحانی مسرتوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ان دولت کے غلاموں
کو یہ معلوم نہیں کہ عورت کی خوش قسمتی اور خوش حالی ان کے شوہروں
کی دولت بلند مرتبے اور بیش قیمت پوشاکیں نہیں بلکہ پاکیزہ اور بے لوث
محبت کا وہ جام ہے جو اِن دونوں کو یک جان کردے، روح کو فرحت اور
حقیقی مسرت سے ہمکنار کرے۔ میری روح بھی اسی بے لوث محبت کے لئے
بے قرار تھی۔" آخر...... میری تاریک زندگی میں ایک امید کی کرن دکھائی دی۔
میری آنکھوں نے ایک نورانی چہرہ دیکھا جس سے پاکیزگی اور الفت کا نور
ٹپک رہا تھا وہ چہرہ ایک نوجوان کا چہرہ تھا جس کی آنکھوں میں جادو تھا۔
اور لبوں پر تبسم۔ اُس نوجوان سے نگاہیں ملتے ہی میں نے اپنے پہلو میں ایک
مقدس شعلے کی لپک محسوس کی۔ میں نے ایسا محسوس کیا جیسا کہ میں نے وہ چیز
پالی جس کی مجھے مدت سے تلاش تھی۔ اس نوجوان کو پاکر میں عجیب کشمکش میں
مبتلا ہوگئی۔ میری حالت اس راہ گیر کی سی تھی جسے پیاس نے بہت مضطرب
رکھا ہو۔ اُسے چشمہ نظر آئے مگر پینے کی جرأت نہ ہو...... سماج---- غیرت
بدنامی...... مختلف خیالات برقی سرعت سے میرے دماغ میں آئے۔ مجھے
سماج کا خوف تھا، مگر میری آزاد روح نے سرکشی پر مجبور کردیا۔ میں نے اُن
خوب صورت مکانوں کو خیرباد کہا۔ ان ریشمی پردوں سے سجی ہوئی دیواروں
کو جن میں فریب اور ریاکاری پوشیدہ تھی۔ ان رفیع الشان مکانوں کو
جن میں رہنے والوں کے اخلاق پست ہیں۔ میں نے اُن کے رسم و رواج
سے چھٹکارا پالیا۔ اور خود کو اُس نوجوان کے حوالے کردیا۔ سماج نے

ناک بھنویں چڑھائیں۔ دنیا والوں نے طعنے دیئے۔ مگر میں نے کسی کی نہ سنی۔ اب میں اس چھوٹے سے مکان میں شراب اُلفت سے سرشار دنیاء مافیہا سے بے خبر زندگی گزار رہی ہوں۔"

اس نے اپنی سرگزشت ختم کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے حسین چہرے پر مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ سماج کے فرسودہ قوانین کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے مسرور اور شاداں نظر آتی تھی۔



اُردو زبان کی دلچسپ کہانیاں

اخلاقی حکایتیں نمبر ا سے نمبر ۶ تک اس میں فارسی عربی کتابوں سے مفید اخلاقی قصے لئے گئے ہیں۔ نہایت دلچسپ ہے فی حصہ .. ۸ر

فی سٹ ۳؍

الف لیلہ کی کہانیاں نمبر ا سے نمبر ۶ تک

فی نمبر ۱۲ر فی سٹ .. ۴؍

دل خوش کرنے والی کہانیاں .. ۸ر

بتیسی۔ اس میں بچوں کی ہنسانے والی ۳۲ کہانیاں ہیں اس کا کور نہایت خوب صورت ہے۔ ۵ر

مشغلے۔ اس میں حسب ذیل پیشے کہانیوں کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ آئی سی۔ ایس۔ ایم ایل۔ اے۔ جہاز رانی۔ تجارت۔ وکالت۔ ڈاکٹری۔ انجینیری۔ اڈیٹری۔ معلمی۔ فوجی تعلیم۔ ہوائی جہاز۔ زمینداری۔ یہ کتاب اسکول اور کالج کے طلبا کے لئے نہایت مفید ہے۔ .. .. ۸؍

ایجادوں کی کہانیاں۔ اس میں ریڈیو ہوائی جہاز۔ ریل۔ فوٹو گرافی۔ ڈاکخانہ بجلی۔ پریس۔ بیماریوں کے علاج۔ بائیسکل موٹر کے حالات۔ درجہ بدرجہ ان کی ترقی اور موجودوں کے حالات ہیں۔ اس میں تقریباً ۴۰ تصویریں اور نقشے ہیں۔ اور اسکا ٹیٹل بہت دیدہ زیب ہے۔ قیمت .. ۱۲ر

بہادر لڑکا۔ اس میں محمد علی بانی مصر کے مختصر اور سبق آموز حالات کہانی کے طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ ۵ر

استقلال۔ اس میں ایک دلچسپ کہانی سے بچوں کی ہمت بڑھائی گئی ہے ۳ر

علم و تجارت۔ اس میں بچوں کو علم حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔ اور بتلایا گیا ہے کہ تجارت بھی بغیر علم کے پورے طور پر کامیاب نہیں ہوتی ۴ر

پریوں کی ہنڈیا ۵ر

پریوں کی کہانیاں .. .. ۳؍

بونا درزی ۸ر

مارے ہتھیار ۵ر
ان برادر ۔ ۱۰ر
کھ سکھ ۔ مجلد ۔ از اعظم کریوی ... عہ/
ندوستانی افسانے مجلد ۔ از اعظم کریوی عہ/
سینے ۔ مجلد ۔ ریاض الحق صاحب علیگ کے
سانوں کا مجموعہ ... ... عہ/
خندۂ دل ۔ مجلد ۔ از کوثر چاندپوری یہ
۲۰ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ عہ/
گل و لالہ ۔ یہ کوثر چاندپوری کے تازہ
۱۴ ۔ افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ مجلد ... عہ/
بہار و چمن ۔ یہ بھی کوثر چاندپوری کے تازہ
۱۴ ۔ افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ مجلد ... عہ/
خندۂ برق ۔ کوثر چاندپوری کے افسانوں
کا مجموعہ (زیر طبع) ہے ۔
لیل و نہار ۔ فسانہ عجائب کا قصہ جدید
افسانوی طرز پر ... ... عہ/
جادو کا خزانہ ۶ر
بادلوں کی ملکہ ۶ر
مگرمچھ بادشاہ اور دوسری کہانیاں ۶ر

جادونگر کی راجہ رانی ۸ر
اندھیرے ۔ یہ قدوس صہبائی کے ۱۵
افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۱۲ر
منتخبہ افسانے ۔ یہ مختلف اہل قلم کے
بے مثل ۱۵ ۔ افسانوں کا مجموعہ ہے جس کو
قدوس صہبائی نے مرتب کیا ہے ۱۲ر
داستانیں ۔ یہ قصہ چہار درویش کو
جس کو میر امن دہلوی نے اردو زبان
میں باغ و بہار کے نام سے لکھا تھا
کوثر چاندپوری نے جدید افسانوی طرز
میں نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھا ہے ۱۲ر
دلچسپ افسانے ۔ یہ کوثر چاندپوری کے
بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے جس کو
میں نے دو نمبروں میں شائع کیا ہے
ہر نمبر میں ۱۶ ۔ ۱۶ افسانے ہیں قیمت
نمبر ۱ ... ... عہ/
نمبر ۲ ... ... عہ/

اُردو کی ادبی اور تاریخی کتابیں

تاریخ مثنویات اُردو مجلد معہ انتخاب عہ/۸

تاریخ قصائد اُردو ۔ معہ انتخاب مجلد عہ/۸

تاریخ ریختی مجلد معہ دیوان جانصاحب عہ/۸

تاریخ ریختی حصہ دوم معہ دیوان انشا (زیر طبع)

مجموعہ غزلیات ۔ ۳ جلدوں میں غیر مجلد۔ عہ/۸

انتخاب نظیر اکبر آبادی معہ مقدمہ ۔ مجلد اس میں ۲۰ صفحے کا بہت مفید مقدمہ ہے ۔ تقریباً ۲۰۰ صفحہ کی کتاب ہے ۔ . . . للعہ

اکبر الہ آبادی ۔ اس کتاب میں اکبر الہ آبادی کے حالات اور تمام بہترین کلام کا انتخاب ہے ۲۰×۲۶ تقطیع پر چھپی ہے ۔ مجلد قسم اول عہ/ قسم دوم ۵/

منتخب داغ ۔ یہ احسن مارہروی مرحوم کا دو حصوں میں انتخاب ہے جس کے پہلے حصّے میں ۴ دیوانوں سے ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جس میں فارسی اضافت وغیرہ نہیں ہے ۔ دوسرے حصہ میں داغ کی بہترین غزلوں کا انتخاب ہے ۔ ۲۰×۲۶ تقطیع پر ۲۰۴ صفحوں پر چھپا ہے مجلد ۔ قیمت ۵/

نظم لطیف ۔ اس میں تقریباً سو شاعروں کا بہترین کلام ہے ۔ جدید طرز کے مختلف عنوانات پر ۳۵۰ صفحوں کی کتاب ہے ۔ مجلد . . . ۱/

تحفۂ احسن ۔ جس میں چھوٹے بچوں کے لئے مشہور اور روزمرہ کی کہاوتوں اور مثلوں کو خلاقی پیرایہ میں احسن مارہروی مرحوم نے نظم کر کے اُن کے استعمال کا موقع بتلایا ہے ۔ ۸/

برادران اور نگ زیب عہ/

اس کے علاوہ ہمارے یہاں اور بہت سی ادبی کتابیں موجود ہیں

ملنے کا پتہ :۔ جعفری برادرس ۲۸۰ شاہ گنج ۔ الہ آباد